شعلۂ گل سے
رنگِ شفق تک
شاعری
سعید افسر

شعریٰ مجموعہ

Shola-e-Gul Se Rang-e-Shafaque Tak

By. : Kazi Saeed Afsar

Add. : Kazi Saeed Afsar C/o.Syed Moinuddin
47/370,Gajanan Colony,Govandi,Mumbai-400043,(M.S.)
Mob. : 8097277341

''یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔
نیز شائع شدہ مواد سے اردو کونسل کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے،''

نام کتاب	❁	شعلۂ گل سے رنگِ شفق تک
شاعر	❁	سعید افسرؔ
ناشر	❁	سعید افسرؔ
قیمت	❁	۳۰۰ (تین سو روپے)
صفحات	❁	۳۳۲ / (تین سو بتیس)
تعداد	❁	پانچ سو (۵۰۰)
مطبع	❁	ساجدؔ اردو پریس۔ اکولہ
کمپوزنگ	❁	ضمیر ساجدؔ
مرتب	❁	شکیل اعجاز
سنِ اشاعت	❁	ستمبر ۲۰۱۶ء

کتاب ملنے کے پتے

● قاضی سعید افسرؔ، معرفت سیّد معین الدین

47/370 گجانن کالونی۔ گوونڈی۔ ممبئی 400043 (M.S.)

8097277341

● شکیل اعجاز، مومن پورہ، اکولہ

9373158382

.........آکولہ قیام ہوتا تو غنی اعجازؔ صاحب کے دولتکدے پر نشست کا اہتمام ضرور ہوتا۔ فصیح اللہ نقیبؔ بھی شرکت فرماتے اور سُننے سُنانے کا یہ سلسلہ رات دیر گئے تک جاری رہتا۔ ان محفلوں کی یاد گوشۂ دل میں ہمیشہ محفوظ رہیگی اس مجموعۂ کلام کی اشاعت کے سلسلہ میں شکیل اعجاز کی محنت شاقہ نے اربابِ آکولہ کے احسانات کو مزید گراں بار بنادیا ہے.........

سعید افسر

ہم کو شاعر نہ کہو.........

''نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا'' شاعرانہ اندازِ بیان ہے ورنہ شعر تحسین وآفرین کا متقاضی بھی ہوتا ہے اور صلہ وانعام کا تمنائی بھی۔ تحسینِ ناشناس سے شاعر کی طبیعت اِبا کرتی ہے اور سکوتِ سخن شناس قدرِ شعر کو ضائع کرتا ہے۔ شاعری کا عموماً، فارسی اور اردو شاعری کا خصوصاً درباروں، سرکاروں سے ناطہ رہا ہے۔ صاحبانِ اقتدار کی قدر شناسی' ادب دوستی شاعر وادیب کی کفیل ہُوا کرتی تھی۔ لہٰذا زمانۂ قدیم ہی سے شعراء وادباء کے قافلے سخن شناس وسخن نواز ممدوحین کے دربار تک رسائی کو اپنی معراج تصوّر کرتے تھے اور درباران دُرباران کی حسبِ دلخواہ پذیرائی بھی کرتے تھے۔

پھر وہ دن آئے کہ بادشاہت ختم ہوئی۔ دربارِ شاہی کی کفالت نہ رہی۔ نوابی احتشام، جاگیردارانہ نظام سے ہوکر گذرتی زندگی عوامی ہوتی چلی گئی۔ شعرائے کرام کے جمگھٹے بھی درباروں سے اُٹھ کر عوامی رستوں سے چوپالوں میں آ گئے۔ شعری نشستوں نے ادبی مشاعروں کا روپ اختیار کیا۔ مشاعرہ بہرحال قصرِ اردو زبان وادب کا ایک ایسا باب ہے جس نے اپنی ایک تہذیب آراستہ کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ مزاجوں کا فرق نمایاں ہُوا۔ ایسا کلام کہ جو بیک وقت ہزاروں افراد کی سمجھ میں آجائے شعر نہیں ہوسکتا۔ یہ رُجحان شعر کی سماعت سے زیادہ قرأت پر بھروسہ کرتا تھا۔ لہٰذا شعرائے کرام ''مشاعرے کے شاعر''، ''کتب ورسائل کے شاعر'' کی تخصیص کے ساتھ منقسم ہوئے۔

چند ایک دونوں جگہ کامیاب ہیں۔ بیشتر کسی ایک جگہ۔ کتابی صورت میں کلام پیش کرنے والے شعراء نے مشاعرے کے کامیاب شعراء کو بہ نظرِ دیگر دیکھا اور مشاعرہ کی کامیابی نے اسٹیج کے شعراء کو کتاب بردار شعراء سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی صلاح دی۔ بقول

مشفق خواجہ (خامہ بگوش) ''ہم نے بہت سے ایسے شاعر دیکھے ہیں جو زندگی بھر مشاعرے لُوٹتے ہیں اور جب ان کا دیوان شائع ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود لُٹ گئے۔ ایسے بے شمار دیوانوں کا ادب کی تاریخ میں نہیں کاغذ کی ضیاع کی تاریخوں میں ذکر ملتا ہے۔''

مشاعرہ میں مشاہرہ کا چلن جگر صاحب کے زمانے میں ہُوا۔ یہیں سے مشاعروں میں پروفیشنلزم کی بنیاد پڑی۔ فی زمانہ مشاعرہ کے اسٹیج پر بنے رہنا، مشاعرے پڑھنا، مشاعرے لُوٹنا، اسٹیج پرفارمنس، ترنم، تحت اللفظ کے اُتار چڑھاؤ، ہاؤ بھاؤ کی تربیت، گروپ ازم یا پھر بدلے کی دعوتیں کہ ''من ترا روپیہ می دھم تو مرا درھم بدہ'' کے اصول پر مشاعروں میں مختلف لابیز سرگرم عمل ہیں۔ ان مشاعروں کا ادب کی دنیا سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اسٹیج کی زینت کے لئے حسنِ بیباک و بے حجاب کے ناز و ادا کے ساتھ ترنم کا تڑکا مشاعرہ کے لئے ناگزیر ہو گیا ہے۔

اگلے وقتوں میں بھی شاعروں میں اساتذہ کے الگ الگ گروپس، الگ الگ حواری ہوتے جو اپنے اپنے جرگے کی تعریف و توصیف میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ مشاعروں میں ایک طرح کی ادبی معرکہ آرائیاں ہوتیں جو گرمیٔ محفل کا باعث ہوتیں اور ادبی شہ پاروں کے وجود میں آنے کا ذریعہ بھی۔ اگلے ادیب و شاعر اپنے فن کے تئیں مخلص ہوتے۔ شہرت و مقبولیت کی خاطر انھیں آج کی طرح ہتھکنڈے نہ آتے تھے۔ نظیر اکبرآبادی ساری زندگی اپنی دھن میں اپنے رنگ کی شاعری کرتے رہے، جو عوامی شاعری تھی مگر درباری شاعروں نے جیتے جی اسے مان کر نہیں دیا۔ بعد میں محققین کو نظر آیا کہ نظیر کی شاعری وطنی شاعری ہے۔ اس میں ہندوستانیت کی دھڑکن ہے پھر نئے سرے سے نظیر کی شاعری کو دیکھا، سمجھا اعتراف کیا گیا۔

آج کسی کو نظیر کی سی دھن نہیں ہے۔ ہر ایک اپنے ادبی کارناموں پر تحقیق اپنی نگرانی میں کروالینا چاہتا ہے۔ مختلف ادبی رسائل مختلف شرائط پر گوشے نکال رہے ہیں اکثر ''مسند نشین در گوشہ'' شاعر اپنے ادبی گوشوں کی رہنمائی خود ہی فرماتے ہیں۔ اپنے حلقہ بگوشوں سے اپنی پسند کے مضامین لکھوا کر یا بدستِ خود بدہانِ خویش کے اصول پر عمل

کر کے لیبل کسی اور کا لگوا کر پورا گوشہ متعلقہ رسالے کو مع شرائط حوالے کر کے بہترین بلکہ زرّین گوشے پر نزولِ اجلال فرماتے ہیں۔ کچھ اپنے ادبی کارناموں کے خود ہی ڈھنڈورچی بنے اپنی شخصیت اور فن پر خود لکھ کر، لکھوا کر کتابوں کے ڈھیر پر اپنے نام کا جھنڈا خود ہی لہراتے ہوئے ایستادہ نظر آتے ہیں (چاہے ان کتابوں کی ادبی حیثیت صاحبانِ نظر کے نزدیک کچھ نہ ہو)

اس صورتِ حال میں کوئی شاعر جس کی شاعری کی عمر ساٹھ برس ہو رہی ہو۔ مشاعروں سے اجتناب کرتا ہو، شعری نشستوں سے حتی الوسع گریزاں ہو، احباب کے اصرار کے باوجود شعر سنانے کے معاملے میں انتہائی محتاط ہو، چھپنے چھپانے کے سلسلے میں بھی قلندرانہ بے نیازی سے کام لیتا ہو اور شاعری کو حرزِ جاں بنا کر رکھے ہوئے ہو تو سماعتیں سراپا انتظار بن جاتی ہیں۔ بصارتیں سراسر حیرت ہو کر رہ جاتی ہیں اور بصیرتیں والہانہ انداز میں آغوش وا کر کے اس کی شاعری کی بلائیں لینے لگتی ہیں۔

یادش بخیر! آکولہ میں برسوں پہلے (۱۹۸۸ء) میں ایک ہمہ طرحی مشاعرہ ہُوا تھا۔ آرگنائیزر تھے خواجہ زین العابدین نایابؔ اور ضمیر ساجدؔ۔ چوالیس شعراء نے حصّہ لیا تھا۔ قرعہ اندازی کے ذریعہ ہر شاعر کو علیٰحدہ علیٰحدہ طرحی مصرع دیا گیا تھا۔ مشاعرہ شعراء کے لئے طرحی اور سامعین کے لئے گویا غیر طرحی ہو گیا تھا۔ مشاعرہ سے چند ثانئے قبل پتہ چلا کہ بمبئی سے ایک مہمان شاعر بھی تشریف فرما ہیں۔ عین وقت پر انھیں جو مصرع دیا گیا تھا وہ کرشن بہاری نور لکھنوی کا مصرع تھا۔

"مَیں نے پتھر کی طرح خود کو تراشا ہے بہت"

راقم الحروف نے اس مشاعرے کی نظامت کی تھی اور شعراء کی تعداد تک اس لئے یاد رہ گئی کہ ہر مصرعِ طرح کو تین تین مصرعے لگا کر، اس میں شاعر کا تخلّص کھپا کر بطور تضمین اتنے قطعات کہے گئے تھے اس طرح نظامت بھی منظوم ہو گئی تھی۔ تخلّص اُن تین مصرعوں میں کہیں آتا۔ سامعین تخلّص سُن کر اندازہ کر لیتے کہ کون شاعر پڑھنے والا ہے اور

مصرعِ طرح پر تضمین سن کر غزل کی زمین سے آشنا ہوجاتے۔اس مہمان شاعر نے اس مدّتِ قلیل میں جو غزل کہی اور پیش کی تھی۔اس کے تین شعر آج بھی ذہن پر مرتسم ہیں۔

کوئی خنجر کوئی بازو مِرا قاتل نہ بنا
ہاں مِرے خوں نے مجھے خون رُلایا ہے بہت

زندہ رہنے کے لئے سینکڑوں تدبیریں کم
اور مَرنے کے لئے ایک بہانہ ہے بہت

کل کی تاریخ میں ہم لوگ بھی مجرم ہونگے
ہم نے چُپ رہ کے یہاں خود کو بچایا ہے بہت

قاضی سعید افسرؔ سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔مشاعرے کے بعد ان سے باتیں ہوئیں۔ان کے ساتھ نشست ہوئی تو لگا کہ ایک مرنجا مرنج، سراپا انکسار شخصیت سے مِل رہے ہیں۔گفتگو کا بڑا نپا تُلا شائستہ انداز۔بات چیت میں ایک طرح کی اپنائیت سی، بھولپن کا سا مزاج، اپنی مٹّی اپنے وطن سے اپنائیت اور یگانگت کی بوباس نے انھیں بہت جلد ذہن و دل سے قریب کردیا۔حضرت غنی اعجازؔ کے دولتکدے پر اکثر ان کے ساتھ نشستوں کے مواقع نصیب ہوئے۔ان سے اشعار سُنتے وقت ایک قسم کی مرعوبیت اور عقیدت دامن گیر ہوتی کہ ان کی غزلیں اُستادانہ مہارت کا آئینہ، اساتذہ کی نجیب الطرفین غزل کا عکس اور زبان و بیان کی ندرت و آراستگی کا حسین امتزاج ہوتیں۔اپنی غزل سناتے وقت طفلِ مکتب کے سبق سنانے کا سا انداز در آتا۔چند نشستوں کے بعد ایک بار اچل پور کے احباب سے ان نشستوں کا ذکر ہوا تو سب نے حیرت کا اظہار کیا کہ ہم لوگ تو بے حد اصرار کے بعد بہ مشکل ان سے ایک آدھ غزل کے چند اشعار سُن پاتے ہیں ورنہ وہ اپنا کلام سنانے میں سدا تکلّف سے کام لیتے ہیں۔شاید آکولہ کی ان نشستوں میں حضرت غنی اعجازؔ کی محبوبیت اور شخصی جاذبیت کا اثر بھی ہوتا تھا۔بہر حال ان ابتدائی نشستوں ہی میں جن اشعار نے مجھے ان کا گرویدہ بنالیا ان میں سے چند حسبِ ذیل ہیں۔

وہ دیکھنے میں بظاہر بہت ہی سادہ تھا
مگر کبھی نہ کھلا اس کا کیا ارادہ تھا
معاملات میں افلاس کھل گیا اس کا
تکلفات میں جب تک تھا شاہزادہ تھا

موجِ خوں مسجد کے مینارے بہا کر لے گئی
آدمی تھا بھی تو مستغرق مناجاتوں میں تھا
رفتہ رفتہ گھر کے دروازوں کو دیمک کھا گئی
اور وہ مصروف بے مصرف ملاقاتوں میں تھا

جو گھونسلے ہی میں دانہ اُتار سکتا ہے
اُڑا اُڑا کے وہ بھوکا بھی مار سکتا ہے
اے برگِ زرد مجھے اپنی کپکپاہٹ دے
یہ خوف ہی مری دنیا سنوار سکتا ہے

پئے سیرِ گُل تو گئے سبھی، ولے کب کسی کی نظر پڑی
مَیں مثالِ قطرۂ شبنمی سرِ نوکِ خار ہَوا پہ تھا
کسی ایک رُخ پہ نہ چل سکا نہ مَیں شمع بن کے پگھل سکا
نہ مَیں بجھ سکا نہ میں جل سکا مِرا انحصار ہَوا پہ تھا

اُن کے مختصر سوانحی کوائف دیکھیں تو........قاضی سیّد سعید الدین نام ہے۔افسر تخلص۔والد کا نام قاضی سیّد معین الدین ہے۔آبائی وطن ایلچپور (اچل پور) ہے۔قاضی سعید افسر کی ولادت مدھیہ پردیس کے ''ہردا' ضلع کے موضع کھڑکیا ڈپو'' میں ہوئی۔تاریخِ ولادت ۲۶/مارچ ۱۹۴۱ء بروز سنیچر بمطابق ۲۷/صفر ۱۳۶۰ھ ہے۔اُس دن (یعنی مہینے کے آخری شنبہ کو) برطانوی دورِ حکومت میں یومِ تعطیل ہوتا تھا۔
ایس۔ایس۔سی ۱۹۵۹ء میں رحمانیہ ہائی اسکول اچل پور سے کیا۔۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۳ء

تک میونسپل کمیٹی اچل پور میں عارضی طور پر اسسٹنٹ ویکسی نیٹر کی حیثیت سے ملازمت کی۔ذاتی مصروفیت کے نام پر ۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۴ء تک غازی لائبریری میں لائبریرین کے فرائض انجام دیتے رہے۔اسی دوران ہفت روزہ طرحی نشستوں کا انعقاد وانتظام کرتے رہے۔۱۹۶۵ء میں محکمۂ صحت عامّہ ناگپور کے زیرِ نگرانی ویکسی نیٹر کی ٹریننگ لی۔پھر ۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۸ء تک محکمہ صحت عامّہ میں ویکسی نیٹر رہے۔۱۶ر فروری ۱۹۶۹ء کو ترکِ وطن کرکے ممبئی جا بسے۔۲۶ر فروری ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۳ء تک ''آل انڈیا گلاس ورکس'' نامی کمپنی میں ملازمت کی۔کمپنی بند ہونے کے بعد ۱۹۷۳ء سے ۲۰۰۵ء تک ممبئی میں حصولِ معاش کے طور پر دیگر ملازمتیں کرتے رہے ۱۹۷۸ء میں ہومیو پیتھک طریقۂ علاج کے لیے تربیت حاصل کی۔ملازمتوں کے ساتھ ساتھ جزوقتی ہومیو پیتھک معالجہ ۱۹۷۹ء سے ۲۰۰۴ء تک کرتے رہے۔۲۰۰۵ء سے تا حال ہمہ وقتی معالجہ شغلِ طمانیتِ روح وقلب بھی ہے۔ذریعہ معاش بھی اور خدمتِ خلق بھی۔

آج جب ان کے فنِ شعر پہ خامہ فرسائی کو بیٹھا تو سوچنا پڑ رہا ہے کہ کس طرح شروع کروں۔بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر ہیں مگر فی الوقت میرا مطمحِ نظر ان کی غزل ہے۔غزل کے سلسلے میں ان کی وسیع المشربی ان سے کہلواتی ہے ؎

غزل غالبؔ، نہ تنہا میرؔ سے ہے　　　بجڑی صد حلقۂ زنجیر سے ہے

گویا وہ شخصیت پرستی کے حصار سے نکال کر غزل کے حُسن وارتقاء کو بیشتر نغز گو شعرائے کرام کے خونِ جگر کی مرہونِ منّت قرار دیتے ہیں۔(یہ شعر سن کر شبّیر احمد قرارؔ نے کہا تھا کہ آپ نے ہزاروں روحوں کو خوش کر دیا) غزل کے ورود کی کیفیت بیان یوں ہوتی ہے ؎

ایک نقطہ جو ہے موہوم پسِ پردۂ جاں　　　ذہن کی سطح پہ پھیلے تو اُبھر آئے غزل

شعر گوئی لفظی بازیگری نہیں بلکہ الفاظ کو نگینوں کی طرح جڑنے یعنی مرصع سازی کا کام ہے لہٰذا کہتے ہیں ؎

نہیں ہے لفظ کی بازی گری کا نام ہُنر
گہر کے ڈھب پہ ہے شبنم کو ڈھال کر لانا

ان کے نظریۂ شعر سے آشنا ہونے کے بعد جیسے ہی ہم ان کی شاعری کو بہ نظرِ غائر دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے یکسوئی کے ساتھ، غزل کے فن پر محنت و مشقتِ شاقّہ کے بعد برسوں کی ریاضت کے صلے میں غزل گیان حاصل کیا ہے۔

مَیں جو بھی کہتا ہوں اپنے لئے نہیں کہتا کہیں ہوا ہے کہ نغمہ برائے نَے ہوگا

ان کا سوز دروں جب الفاظ کے پیکر میں ڈھلتا ہے۔ جذبات مُصَوَّر ہو کر شعر کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔

کس متانت سے گری برقِ جمالِ جاں سوز
کس عقیدت سے مِرا قلبِ تپاں ٹوٹا ہے

یا پھر یہ کہ۔

طواف کرتے ہوا اپنا تمھیں نہیں معلوم میانِ مرحلۂ آگہی ہے جاں دیوار

جب وہ کفایت لفظی کے ساتھ، گٹھے ہوئے انداز میں شعر کہتے ہیں تو قافیہ کے ساتھ پیوست ہو کر ردیف ''در سروری رقصم'' پکار اُٹھتی ہے۔

عظمت مردمی ہے بے طلبی ذلّت مردمی کا نام طلب
دستِ مفلس سوال کو نہ اُٹھا چشمِ منعم رہی سلام طلب
فرصتِ خاص ! عرصۂ ہستی عرصۂ حشر یعنی عام طلب

جہاں کہیں قافیہ اور ردیف ہم صوت ہوتے ہیں تو پوری غزل میں ایک جھنکار کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

وہ اِک صدی کا بنائے تھا انتظام تمام
کہ ایک پل میں ہوئی عمرِ نا تمام تمام
ابھی مَیں کر بھی نہ پایا تھا ایک جام تمام
ندا یہ آئی کہ بس ہو چکی یہ شام تمام
خوشی ہماری بجا ہے، مباح فخر ہمیں
لکھی ہے مملکتِ غم ہمارے نام تمام

شاعر کی خودی اسے خود سروں کے آگے جھکنے نہیں دیتی لیکن کسی کا عجز و انکسار اسے اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔

پیشِ مردانِ تکبّر اِک سمندر ہوں مگر
عاجزوں کے سامنے شبنم ہُوا جاتا ہوں مَیں

ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ جیتے جی فنکار کی قدر اس کے قد کے بقدر نہیں کی جاتی۔ مرنے کے بعد اس کا بُت بنا کر پرستش کی حد تک مبالغہ آرائیاں ہونے لگتی ہیں۔

جنسِ بے ضرورت تھے وقت کی نگاہوں میں
اُٹھ گئے تو بن بیٹھے وقت کی ضرورت ہم

اس لئے شاعرانہ نفیس حسّیت اس کے قلم سے یوں جادو نگاری کرتی ہے۔

آج یوں بیٹھے ہیں گویا بیٹھنا ہے بس یونہی
اور جب اُٹھنے پہ آئیں گے تو یوں اُٹھ جائیں گے

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ۔

تم مِرا لہجہ نہ دیکھو، میری باتوں کو سُنو چل دیا تو پھر نہ آؤں گا پلٹ کر اور مَیں

فی زمانہ قدرِ شعر بھی وہ نہ رہی۔ نہ وہ سخن فہمی و سخن نوازی ہے نہ وہ قدر افزائی۔ شعر سُنانا نہ ہُوا

گویا صحرا میں اذان دینا ہوگیا۔ چھپی ہوئی صورت میں کسی کے ہاتھ میں غزل تھمائیں تو جیسے اندھے کے ہاتھ آئینہ دے رہے ہیں۔ اسی لئے شاعر کا قلم کرب کا اظہار کرتا ہے۔

بیٹھے تھے لوگ کان پہ صافہ لپیٹ کر اور اس نے حکم شعر سنانے کا دے دیا

مردہ دل کو نہ پڑھا جہدِ مسلسل کا سبق
اندھی آنکھوں سے نہ کہہ شام سہانی کیا ہے

اور پھر توے کی تیری، ہاتھ کی میری کے اس دَور میں۔

اور سارے ہی فن ہوئے مہنگے رہ گئی شاعری ہی سستی ایک

دوسری طرف وہ شاعر کی سماجی اور معاشرتی ذمہ داری سے روگردانی کو بھی روا نہیں گردانتے۔ شاعر یا کوئی بھی فنکار اپنی خودی، اپنی انا کے سلسلے میں حساس ہوتا ہی ہے اور اسے ہونا بھی چاہئے لیکن۔

جو شہ سوار ہیں ان کو ہُنر یہ آتا ہے
سمندِ تیز صفت کو نڈھال کر رکھنا

وہ انا کو عزّتِ نفس کی حد تک صحیح جانتے ہیں۔ اس سے آگے غرور کی حد شروع ہوتی ہے جو ہر لحاظ سے غیر مطبوع ہے۔

سخنوروں کو کہاں اپنی ذات پر غرّہ
وہ کم ہُنر ہیں جو دادِ ہُنر کو دیکھتے ہیں

غزل کی سرسبزی و شادابی اور بارآوری کی وجوہ میں ایک یہ بھی ہے کہ کبھی نئی لفظیات کے ساتھ، کبھی طرزِ ادا کی نُدرت کے ساتھ اگر وہ پیش پا افتادہ مضامین کی راہ پر بھی گامزن ہوتی ہے تو نیا پن لگتا ہے۔ اس شعری مجموعے میں بیشتر مثالیں ایسے اشعار کی مل جائیں گی جن کی یا تو تشکیل نویلی ہے یا کسی دعوے کی دلیل نئی ہے یا کسی واقعے یا سانحے کی تاویل نئی ہے۔

گھر کے فاقوں کی کہانی چوک تک جانے نہ دو
ایک چادر سی دھویں کی چھت پہ لہرائے رکھو

گاؤں کے جھونپڑوں کے چھپروں میں سے نکلتا ہُوا دھواں جب کہ چولہے میں لکڑی جلائی جا رہی ہو۔ ہلکی بارش کے سبب یا شبنم کے سبب چھپّر میں نمی سی ہو۔ ایسے گھر جو کسانوں ،مزدور پیشہ لوگوں ،غریبوں کے گھر ہوتے ہیں۔ شعر اُن کی تصویر کشی کرتا ہے۔

باندھے رکھے ہیں ہاتھ مِرے اس خیال نے
رکھ دے نہ کوئی کچھ مِرے دستِ دراز پر

قناعت کی تصویر کشی کرنے والے، اپنی آبرو کو بچائے رکھنے کی شعوری کوشش والے اس شعر کے سلسلے میں عرض کروں کہ یہ میر تقی میرؔ کے چراغ سے جلا چراغ ہے۔ نئی لفظیات کے ساتھ درج ذیل شعر کی نو آراستہ شدہ شکل ہے۔

آگے کسو کے کیا کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

کبھی پیوند لگے کپڑے غربت اور مفلسی کی علامت ہُوا کرتے تھے۔ آج Jeans کے زمانے میں پیوند کاری اور بوسیدگی فیشن کے زمرے میں آگئی اور سادہ کپڑوں کے مقابلے میں زیادہ مہنگے بھی ہیں۔ کبھی تعمیرات میں کوئی کھانچا رکھ دیا جاتا ہے۔ کبھی کسی ستون کو، چھجے کو ادھورا چھوڑا جاتا ہے یا ادق رکھ دیا جاتا ہے۔ کبھی کار کے ونڈ اسکرین پر فٹ بال یا پتھر یا کرکٹ بال کی چوٹ سے اسکرین کے تڑخنے کی تصویر کاری ہوتی ہے کبھی کسی دیوار کی خامی خوبصورت تصویری فریم سے چھپائی جاتی ہے۔

نمودِ عیب ہنر بن گیا زمانے میں چھپایا جاتا ہے شیشے سے رخنۂ دیوار

کبھی کبھی شہروں، محلّوں، علاقوں کے نام ایسے ہوتے ہیں گویا زنگی کا نام کافور۔ ایسی

صورتِ حال بڑی مضحک کیفیت پیدا کرتی ہے۔

دیکھئے یہ بھی چہرہ دستی ایک نام چالیس گاؤں بستی ایک

آج کا انسان گویا مشینی انداز کی زندگی جی رہا ہے۔رشتے ناطے،جذبات،احساسات کے رنگ روپ بدل گئے۔

یہ آدمی نہیں چابی بھرے کھلونے ہیں
ملول شخص سے مل کر بھی مسکراتے ہیں

وقت کے سلسلے میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ کیسے اور کب دبے پاؤں گذر جاتا ہے نشان تک نہیں ملتا۔اس مشہور اور معلوم بات کو یوں رد کیا جاسکتا ہے۔

چہرے کی جھرّیوں میں یہ تحریر پاؤ گے
کہتا ہے کون وقت اثر چھوڑتا نہیں

کشمیر کو جنّت نظیر کہا گیا ہے۔فارسی کا بہت مشہور شعر جو زباں زدِ خاص وعام ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمیں است ہمیں است وہمیں است وہمیں است

لیکن کیا آج یہ بات ہم اعتماد کے ساتھ دہرا سکتے ہیں؟ حالات یہ ہیں کہ۔

جنّت کو بھی دوزخ میں بدل دیتا ہے انساں
بہتر ہے کہ دنیا میں نہ کشمیر سا کچھ ہو

محاوروں کا برمحل استعمال شعر کو جامعیت عطا کرتا ہے۔شعر میں تہہ داری آجاتی ہے۔لُطفِ بیاں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔درج ذیل اشعار اس کی مثالیں ہیں۔

میں بیٹھا ہوں دعا سے ہاتھ اُٹھائے ندامت اس قدر تقصیر سے ہے

وہ کانٹے راستے پر اب نہیں ہیں زمانہ راستے پر آگیا کیا!

پھوٹی کوڑی نہ جیب میں ہو مگر اپنا سکّہ جمائے رکھتے ہیں

آب جاتی تو کہیں آب میسّر آتا
پیاس پھر کیوں نہ انھیں جان سے پیاری ہوتی

ایہام، شعری حسن میں اضافہ کرتا ہے۔ شعر اکہرا نہیں رہتا۔ کئی رنگ جھلکنے لگتے ہیں ۔

اگر وہ صید ہوس تھے تو تم شکار طلب
ہَوا کا زور کہیں کم ، کہیں زیادہ ہے

یہاں ''ہوا'' ''ہوس پرستی'' کے معنی میں استعمال ہو کر لطف دے رہی ہے۔ استعاروں کا بر محل استعمال زورِ بیاں میں اضافے کا باعث بھی ہوتا ہے اور کفایت لفظی اس کے صوری حسن کو بڑھا دیتی ہے۔

خواہشیں بڑھتا سمندر ، آرزو اُٹھتا پہاڑ
زندگی گھلتا نمک ہے ، آدمی مٹتی لکیر

تلمیحات کا استعمال غزل کے شعر کو بجا طور پر گہرائی اور گیرائی عطا کرتا ہے۔ ان کی غزل میں تلمیحات ایک التزام کے ساتھ استعمال ہوئی ہیں۔ بار بار استعمال ہونے والی تلمیحات کے برتنے میں ندرت ان کو تازگی عطا کرتی ہے۔ مثلاً

لبِ فرات ٹہلتے ہیں تشنہ لب لیکن
کسی یزید سے ہم مانگتے نہیں پانی

کربلا میں اہلِ بیت کی قربانی کو کس طمطراق کے ساتھ اُجاگر کیا گیا ہے۔

صدائیں آج بھی لبیک کی ہیں
وہ اِک آواز تھی معجز اثر کیا

حضرت ابراہیمؑ نے جب کعبہ کی تعمیر مکمل فرمائی تو ربّ کعبہ کی طرف سے حکم ہُوا کہ اے

ابراھیمؑ میرے بندوں کو میرے گھر کی طرف آواز دے کر بلاؤ۔حضرت ابراھیمؑ نے تردّد کے ساتھ عرض کیا کہ یا اللہ! یہاں میرے اور میرے بیٹے (حضرتِ اسمٰعیلؑ) کے علاوہ اور کون ہے جسے آواز دوں؟ارشاد ہُوا۔تم پکارو تو سہی۔حضرت ابراھیمؑ نے اپنے رب کے حکم پر دنیا کے لوگوں کو کعبہ کی طرف (عبادت کے لئے) پکارا۔آج دنیا کے ہر کونے سے زائرین ہر سال حج کے لئے کعبہ کی طرف دوڑتے ہیں۔حج کے موقع پر تلبیہ پڑھتے ہیں۔

لبیک، اللّٰھمّ لبیک......تو یہ حضرتِ ابراھیمؑ کی اسی معجز اثر آواز کا جواب ہوتا ہے۔

آدم وگندم کا رشتہ جب ازل سے ہے تو پھر
ختم ہر اِک راستہ بازار پر ہونا ہی تھا

گندم کشت زار میں پیدا ہو کر منڈی میں بکنے کے لئے آتا ہے۔اناج انسان کی ضرورت ہے اس لئے اسے خریدنے کے لئے بازار میں جانا ہی پڑتا ہے۔جب اللہ تعالیٰ نے طے فرمایا۔انی جاعل فی الارض خلیفة تو اس خلیفہ کے زمین پر نزول کے لئے شجرۃ ممنوعہ کو سبب بنایا۔آدمؑ سے کہا لا تقربا ھٰذہا الشجرۃ۔قرآن نے توضیح نہیں فرمائی کہ درخت کیا تھا۔بائبل کی روایت کے مطابق وہ سیب کا درخت تھا۔قرآن کے مفسرین کے نزدیک وہ گیہوں کا پودا تھا۔سوال سیب یا گندم کا نہیں۔سوال شجر ممنوعہ کا تھا۔نزدیک گئے اور یہی بات وجہ بنائی گئی دنیا میں نزول کے لئے۔مزید برآں کہ حضرت محمدؐ نے اس دنیا کو بازار کہا ہے گویا یہ دنیا رہائش کے لائق نہیں ہے بلکہ اشیائے ضروری یعنی اعمالِ صالحہ کے حصول کے بعد قبر، حشر کی تیاری یعنی گھر واپسی کے لئے بازار سے مماثل بتائی گئی ہے۔شعر ان دونوں روایات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

کچھ تلمیحات ایسی ہیں جو اردو غزل میں شاذ ہی استعمال ہوئی ہوں مثلاً۔

جانے کب لے جائے سوداگر کسے معلوم ہے
ایک مدت ہوگئی ہے جان کا سودا کئے

یہ قرآنِ کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس بات کے بدلے خرید لئے ہیں، کہ جنّت انہی کی ہے۔

جسم ایستادہ رہے روح سے خالی ہی سہی
کام ہوتا ہے سلیمانؑ کے عصا کے آگے

حضرت سلیمانؑ کی حکومت اجنّہ پر بھی تھی۔ ہیکل سلیمانی کی تعمیر جنوں کے ہاتھوں کروائی گئی۔ بیت المقدس کی تعمیر کی نگرانی کے لئے حضرت سلیمانؑ عصا کا ٹیک لگائے کھڑے ہوا کرتے تھے ایسی حالت میں ان کی وفات ہوگئی۔ جسم عصا کے سہارے کھڑا رہا۔ جن بیت المقدس کی تعمیر کرتے رہے اس طرح اس کی تعمیر مکمل ہوئی۔ ادھر رفتہ رفتہ عصا کی لکڑی کو گھُن لگ گیا۔ دیمک عصا کی لکڑی چاٹ گئی تو عصا ٹوٹ گیا۔ حضرت سلیمانؑ کا جسم جو عرصۂ دراز سے عصا کے سہارے ایستادہ تھا۔ روح مدّت ہوئی قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ عصا کے ٹوٹتے ہی آپ کا جسم ڈھ گیا۔ تب جنوں کو خبر ہوئی کہ حضرت سلیمانؑ نہیں رہے ورنہ وہ ان کے عصا کے آگے، انھیں زندہ جان کر، مصروفِ عمل تھے۔ (اس شعر کو "طاقت" کی بہترین تعریف اور ایمرجنسی کے دَور کا عکّاس بھی کہا گیا ہے) کہیں کہیں تو ایک شعر میں دو مختلف تلمیحات ہیں۔ مثلاً

نگل گئی کوئی ماہی کسی کو لمحوں میں
نکل گیا کوئی دریا کو منقسم کر کے

مصرعِ اولیٰ میں حضرت یونسؑ کو مچھلی کے نگل لینے کا واقعہ بیان ہُوا ہے اور مصرعِ ثانی میں حضرت موسیٰؑ کا اپنی قوم کو لے کر فرعون کی فوج سے بچ کر نکل جانے کا واقعہ بیان ہُوا ہے۔
آج غزل اپنے لغوی معنی سے نکل کر ہر قسم کی مضامین بندی کر رہی ہے غزل میں تغزل کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں غزل اپنے اصل رنگِ تغزل میں بھرپور جوبن کی اُٹھان کے

ساتھ موجود ہے۔

لے کے انگڑائیاں وہ شامِ غزل
صبح بستر سے اُٹھ رہی ہوگی
سُرخ ڈورے سے ہوں گے، آنکھوں میں
رات کی نیند چبھ رہی ہوگی

پلٹ کے دیکھنے والوں کو دیکھ لیتے ہیں
اگرچہ کرتے نہیں ہیں نظر حسین دراز

جھکی ہی رہتی ہے وہ شاخ جو ثمرور ہے
حیا سے ہوتے نہیں دستِ نازنین دراز

میرے بالوں کے بکھرنے سے تو یوں لگتا ہے
یہ ہَوا بھی ترے آنگن سے چلی ہو جیسے

اپنے تخلّص کا معنویت کے ساتھ سب سے زیادہ کامیاب استعمال مومنؔ نے کیا ہے۔ یہ روایت کہیں کہیں دیگر شعراء کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔ اس شعری مجموعہ میں تخلّص کے برتاؤ کا سلیقہ ملاحظہ فرمائیں۔

نمودِ نام کے خواہاں نہیں ہیں ہم یعنی ہمارا نام ہی افسرؔ نشانِ منصب ہے
دست بستہ کھڑے رہو افسرؔ جانے کرلے وہ کب غلام طلب
باہر سے سبھی اُجلے بگلے کے پَروں جیسے اندر سے سیہ پیکر عوام سے افسر تک

اپنی جائے پیدائش، اپنے وطن، اپنی رہائش گاہ، اپنے گھر سے انسیت ہر ذی روح کو ہوتی ہے۔ انسان کا اپنا مکان (مکان نہیں گھر) گھر والوں سے بنتا ہے۔ رشتے گھر بناتے ہیں ورنہ۔

ابھی تک گھر جسے کہتے تھے افسرؔ　ہُوا اینٹوں کے اِک انبار میں گُم

پھیلتے ہوئے شہر، سمٹتی ہوئی زمین نے رہائش گاہوں کی تعمیرات کو افقی Horizental کی بجائے عمودی Vertical شکل عطا کر دی۔ بلڈنگوں کے شاپنگ کامپلکس، گھروں میں بھی درآئے ہیں۔ لہٰذا مکانات کی ڈیزائننگ گھر کی جمالیاتی تہذیب کو ہڑپ کر چکی ہے۔

اب چنبیلی کے وہ منڈوے ہیں نہ رانی رات کی
ان دکانوں ہی کے چکّر میں تو انگنائی گئی

اگلی نسل اور موجودہ نسل کے گھر کے تصوّر میں کافی فرق ہے۔ فلیٹوں، چالوں، کامپلکسوں میں رہنے والے آبائی گھروں کا ادراک نہیں رکھتے۔ اگلی نسل کی زبانی نسلِ موجود کے لئے پیغام یوں ہے۔

تم نے دیکھا ہی کہاں تم رنگ و روغن پر گئے
ہم نے خود کو چُن رکھا ہے گھر کی ہر دیوار میں

اپنے ایک شعر میں انھوں نے یہ بات ضرور کہی ہے کہ غزل صرف غالبؔ یا تنہا میرؔ سے نہیں ہے بلکہ بیشتر سخنورانِ کامل نے اپنے خونِ جگر سے اس کی آبیاری کی ہے تاہم ان کی غزل کے مزاج پر اغلب رنگ غالبؔ کا ہے۔ انھوں نے غالبؔ کی زمینوں میں غزلیں بھی کہی ہیں۔ درج ذیل اشعار گواہی دے رہے ہیں کہ ان کا مزاجِ شعر غزلِ غالبؔ سے ہم آہنگی کو شعوری طور پر پسند کرتا ہے۔

کہتا یہ کون غالبؔ آشفتہ سر بغیر　عرضِ ہنر میں کچھ نہیں دادِ ہنر بغیر

جس نے دیکھا حالِ افسرؔ پوچھنے بیٹھا مزاج
غالباً غالب ہوئی تھی پیش دتی ایک دن

ہم سے افسرؔ ہزار ہوں گے ایک　اسد اللہ خان غالبؔ تھا

اپنے ایک شعر میں انھوں نے یہ بات ضرور کہی ہے کہ غزل صرف غالبؔ یا تنہا میرؔ سے نہیں
ان کی اپنی کم آمیزی، مجلس آرائیوں سے گریز کی عادت، شاعری کو وجہِ شہرت گردان کر
ناموری کے لئے شعوری کوشش کرنے والوں سے انھیں ممیز کرتی ہے۔

ایسی شہرت سے تو افسرؔ اپنی گمنامی بھلی
شعر نا مقبول ہوں ، مشہور ہو شاعر بہت

میرؔ نے کہا ہے۔

غزل کہنی نہ آتی تھی تو سو سو شعر کہتے تھے
مگر اِک شعر بھی اے میرؔ اب مشکل سے ہوتا ہے

قاضی سعید افسرؔ اس شعر پر صاد کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں۔

دوام ادب میں دواوین سے نہیں ملتا
بس ایک شعر ہی کہہ لے کوئی ٹھکانے کا

اس التزام، اس رچاؤ، اس ریاضت کے ساتھ شعر کہنے اور تقریباً پانچ چھ دہائیوں تک اپنے
آپ کو شہرت، ناموری کے تام جھام سے شعوری طور پر علیٰحدہ رکھنے کے باوجود ان
کے مزاج کا انکسار اس راہ کے اگلے شہ سواروں کے پسِ کارواں اپنے آپ کو کس رنگ میں
دیکھتا ہے۔ اس کی مثال یہ شعر ہے۔

میرؔ و سوداؔ ، ذوقؔ و غالبؔ ، حالیؔ و اقبالؔ و فیضؔ
کارواں کی دھول سا پیچھے چلا آیا تھا میں

فی الوقت آئے دن کئی کئی شعری مجموعے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتے ہیں۔ غزل
اکثر شعراء کو خوش آتی ہے لہٰذا زیادہ تر مجموعے غزلیات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ قاضی سعید
افسرؔ کی غزل میں بالغ نظری، افکار نیز بلیغ اندازِ بیاں، صحتِ مضامین نیز صحتِ زباں، عاجزی
اور منکسر المزاجی کی جھلک، خودی اور خودداری کی چمک، اساتذہ کے مراتب کا پاس ولحاظ،

نسلِ نو کی ہمت افزائی کے لئے تگ و تاز، بزرگ شعرائے کرام کی شعری و ادبی خدمات کا اعتراف نیز نسلِ آئندہ کی تربیت و رہنمائی کے واضح اوصاف نظر آتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر غزل کو غزل رنگ بنائے رکھنے کے جتن، غزل کی ہیئت کو اہتمام و التزام کے ساتھ برقرار رکھتے ہوئے اس کے گیسوؤں کی مشاطگی کی لگن اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ نظر آتی ہے۔

یہ بات پورے یقین اور کامل اعتماد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس مجموعۂ غزل کی اس کے شایانِ شان پذیرائی ہوگی۔ اور اربابِ نقد و نظر اس کا بہ نظر استحسان استقبال کریں گے کیونکہ بقولِ میرؔ

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ اس مجموعۂ کلام کو ادبی دنیا میں اعتبار عطا فرمائے اور نسلِ نو کی غزل گوئی کے لئے مشعلِ راہ بنادے۔ آمین

''دریچے سے دروازے تک''

شمع کی مانند ہے افسؔر کی روداد حیات
شام سے روشن ہوئے اور صبح تک جلتے رہے

مدھیہ پردیش میں ایک مقام ہے کھڑکیا۔ وہاں کے محکمۂ جنگلات کے ڈپو آفیسر کے یہاں ایک لڑکا تولّد ہُوا۔ ان ڈپو آفیسر صاحب کا نام ایس۔ ایم ۔قاضی یعنی سیّد معین الدین قاضی تھا۔ انھوں نے اپنی ذاتی ڈائری میں اس ولادت کا اندراج اس طرح کیا تھا۔

Birth of S.Saeeduddin on 26 th of March 1941 at.1.37.am.at Khirkiya Depot. ہمارا خاندان بیڑیا میں تھا تو وہاں دادا حضرت قبلہ قاضی سیّد حنیف الدین مسعود تشریف لائے اور والد حضرت کو مشورہ دیا کہ وہ حالیہ ملازمت سے مستعفی ہو کر حیدرآباد چلے جائیں جہاں پر مواقع کا امکان ہے۔ اس طرح والد حضرت حیدرآباد جا کر نائب امین جنگلات کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ کچھ ہی عرصہ بعد پولس ایکشن کی کاروائی نے ہمیں حیدرآباد چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور مَیں اپنے خاندان کے ساتھ خوں ریزیاں دیکھتے ہوئے ایلچپور واپس آ گیا۔ ایلچپور میرا آبائی وطن ہے۔ جو کسی زمانے میں برار کا دارالخلافہ نیز گزرگاہِ عسا کر رہا ہے۔ دورِ حاضر نے اسے اچل پور کر دیا ہے۔ اس طرح ایک عظیم تاریخی شہر اچل پور ہو کر رہ گیا ہے میرا تعلق ایلچپور کے اس سادات گھرانے سے ہے جو ارضِ حجاز سے نیشاپور ایران ہوتا ہُوا ہندوستان میں کنھور۔ خلدآباد اور پھر ایلچپور آ کر آباد ہو گیا۔ یہ ہجرت وسکونت یہ تقرر و تبدّل فرمانِ شاہی کے مرہونِ منّت رہا یہ خاندان کئی پشتوں سے دارالقضا کی ذمّہ داریاں سنبھالے ہوئے ہے۔ میرے برادرِ خورد

سیّد غیاث الدین فی الحال قاضیٔ شہر ہیں۔ حیدرآباد سے آنے کے بعد والد حضرت نے دوبارہ محکمۂ جنگلات کی ملازمت اختیار کرلی۔ اس دوران والد صاحب کا تبادلہ ''ہری سال'' ہوگیا جو دھارنی سے قریب ہے۔ وہاں کے خوب صورت مناظر ساگوان کے درختوں کا ہزاروں جگنوؤں کے ایک ساتھ چمکنے سے یکبارگی روشن ہوجانا۔ ایک ناقابلِ فراموش منظر ہے جو ذہن پر نقش ہے۔ جنگل میں رہ کر پڑھائی ممکن نہیں تھی۔ اس لئے میری ضد پر یہ طے ہُوا کہ مَیں دادا حضرت کے پاس ایلچپور میں رہوں اور پڑھائی مکمل کروں۔ جب والد صاحب مجھے ایلچپور چھوڑنے آئے تو انھوں نے ایک فُل اسکیپ سے بھی بڑے کاغذ پر نہایت جلی حروف میں اقبال کے دو اشعار اس پیرائے ◇ میں لکھ کر دئے تھے۔ پہلا شعر جو افقی سمت اختیار کئے ہوئے تھا وہ تھا ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھّی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

اور جو شعر زیریں سمت کو جا رہا تھا۔ وہ شعر تھا کہ ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

آج یہ تحریر کرتے ہوئے میری سمجھ میں یہ آیا ہے کہ اس اندازِ تحریر میں اشعار کی تصویر اور تفسیر دونوں موجود ہیں ان کا جذبہ اتنا صادق تھا کہ ایک کم عمر بچّہ اپنے والد سے ان اشعار کا مفہوم سُنتا ہے اور اس کا شعور ان اشعار کو اپنی پوری زندگی کا شعار بنالیتا ہے۔

والد حضرت شاعری کا بہت ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ ابتدا میں کچھ کلام کہا بھی تھا۔ اقبال کا بہت سارا کلام طویل طویل نظمیں انھیں ازبر تھیں ہم سب بچّے ''ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان'' نیز'' جاوداں پیہم رواں ہر دَم جواں ہے زندگی'' سُن سُن کر بڑے ہوئے ہیں۔ شاہنامۂ اسلام کی تمام جلدیں روزانہ گھر میں سب کو سنا کر ختم کی گئی ہیں۔

شوکت تھانوی کے ناول بھی سب کو پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔ ہری سال سے پرتواڑہ ڈپو تبادلہ ہونے کے بعد ہمارا خاندان ڈپو کے سرکاری بنگلے میں منتقل ہوگیا۔ اس زمانے میں کچھ طلبہ اور دو طالبات کا قافلہ تین کلومیٹر پیدل چل کر گورنمنٹ آئی۔ ای۔ ایم اسکول آتا اور شام کو پورے نظم وضبط کے ساتھ واپس جاتا۔ میری مسافت کچھ زیادہ تھی کیونکہ ڈپو پرتواڑہ میں مغلائی کے بھی بعد آباد ہے اس ڈپو کا ماحول بھی شاعرانہ تھا۔ برگد اور پیپل کے بڑے بڑے قدیم درخت۔ آم کے درختوں کی پوری امرائی، بیر کے درخت غرض اچھا خاصا جنگل آباد تھا ببول بن تو ایک بہت بڑے قطعہ زمیں پر پھیلا ہُوا تھا۔ چھوٹے سے باغ کے سامنے ڈپو آفیسر کا آفس پھر رہائشی بنگلوں اور کوارٹرس کی لائن تھی۔ باغ کی دونوں جانب مہندی کی تراشیدہ باڑھ کے درمیان سے ہوکر جانے والے راستے ڈپو سے لگ کر سیّد صاحب کا مزار جہاں شاہ صاحب اپنے کٹیا نما مکان میں براجمان رہتے۔ وہ ایک چرواہے سے اس کی سریلی آواز میں ''بڑی مشکل سے دل کی بیقراری کو قرار آیا'' ایک جذب کے عالم میں سُنتے تھے۔ یہ ماحول اور دیگر عوامل تھے جو مجھے انجانے طور پر شاعری کی طرف گھیر کر لا رہے تھے۔ جیسے دادا حضرت کا مجھے مشاعرے میں جاتے ہوئے دیکھ کر یہ کہنا کچھ شعر (یا شیر) پکڑے بھی ہیں۔ یا ویسے ہی مشاعرے میں جا رہے ہو۔ یا مڈل اسکول میں عبدالغفار صاحب (جو ایک مثالی استاد اور وضعدار شخصیت کے مالک تھے) کا یہ کہنا آپ نے نظم لکھنے میں کوئی مصرع چھوٹا اور کوئی مصرع بڑا لکھا ہے۔ یہ پوری کلاس ایسا لکھ سکتی ہے لیکن آپ ایسا نہیں لکھ سکتے کیونکہ آپ شاعروں کے خاندان سے ہیں۔ ان محرکات اور احساسات کی بناء پر میں نے درجہ ششم سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ سب سے پہلے کلاس ٹیچر قاضی ذبیح الرحمٰن ندیم صاحب نے مجھے شعر لکھتے دیکھا اور شعر میرا ہی ہونے کی تصدیق کے بعد انھوں نے دوسرے دن مجھے گھر بلایا۔ اپنی والدہ کو دِکھایا کہ یہ بچّہ ابھی سے شعر کہتا ہے پھر مجھے نصیحت کی کہ شاعری آسان نہیں ہے۔ اسے زندگی بھر خون پلانا پڑتا ہے۔ شائد اسی لئے مَیں نے آگے چل کر کہا تھا کہ۔

تمام رات جلانا ہے خونِ دل افسرؔ کہ رنگِ صبح غزل اور بھی نکھر جائے

میری شاعری کے پہلے سامع ڈپو کی لاری چلانے والے ڈرائیور لالو بھائی تھے۔ جو بڑے انہماک کے ساتھ میری شاعری سُنتے تھے۔ گھر میں کسی کو میرے شاعر ہونے کی خبر نہیں تھی۔ شاعری کے مشغلے کو جاری رکھتے ہوئے مَیں نے ۱۹۵۹ء میں رحمانیہ ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ تب تک ہمارا خاندان ایلچپور منتقل ہو چکا تھا۔ میں ان دنوں ظفر عزیزؔ کے والد صاحب رحیم خاں صاحب کی ہوٹل میں بیٹھنے لگا تھا وہاں اچھی ہستیاں موجود رہتی تھیں۔ صوفی صاحب جو ظفر عزیزؔ کے ماموں تھے۔ دن بھر بیٹھے رہتے۔ حاجی رفیع اللہ صاحب اور امداد علی صاحب کے درمیان دوستانہ نوک جھونک کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔ مجھے ان لوگوں سے بہت کچھ سیکھنے مِلا۔ وہیں میلاد خواں بسم اللہ خاں کی ہوٹل تھی۔ ان کے ایک جماعتی شیخ داؤد صیقل گر نے مجھے صیقل کرنا شروع کیا۔ وہ مجھے کہتے کہ آپ کے خاندان میں دادا حضرت کے بعد تایا حضرت کرم محی الدین کرمؔ۔ تایا زاد بھائی خورشیدؔ ایلچپوری۔ اور مشتاق نقویؔ کے بعد کوئی شاعر نہیں جو نعت کہہ سکے۔ اس لئے آپ کو چاہئے اپنی شاعرانہ صلاحیت کو بروئے کار لاکر نعت کہیں۔ اس طرح میرا نعت گوئی کا سلسلہ شروع ہُوا۔ بسم اللہ بھائی کی جماعت کے نعت پڑھنے کے بعد میرے گھر میں میرے شاعر ہونے کی اطلاع ہوئی۔ پھر حسینی دنگل (جہاں فی البدیہہ کلام کہہ کر جواب دینا ہوتا ہے) کی شرکت نے بھی میری ذہنی تربیت میں بڑا حصّہ لیا۔ دریں اثناء ۱۹۶۰ء میں عم زاد برادرِ گرامی ڈاکٹر مشتاق نقویؔ نے اپنے کلینک کے ساتھ غازی لائبریری قائم کی اور اس کی دیکھ بھال یا لائبریرین شپ مجھے سونپ دی۔ ادبی رسائل و کتب کے مطالعہ نے مزید جلاء بخشی۔ پھر لائبریری میں ہر ہفتہ طرحی نشست کا سلسلہ شروع ہُوا۔ اس کا پورا انتظام میرے ذمّہ تھا ان نشستوں میں میرے علاوہ بہت سے نو آموز شعراء نے تربیت پائی۔ محمد علی خاں شاداںؔ، رشید صابرؔ، وارث بیدلؔ، اور دیگر شعراء پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ لائبریری کی مصروفیت اور شاعری کی مشغولیت کے ساتھ ساتھ میں

Vaccinator کا کام میونسپل کمیٹی کے تحت کرتا رہا۔ امراؤتی سے .S.T.C کی تیاری میں مشغول تھا کہ والد صاحب نے بیڑیا کے ڈاکٹر عبدالکریم کی ایماء پر مجھے اندور ہومیو پیتھ کا کورس کرنے کیلئے بھیجنا چاہا۔ S.T.C. کرنے کی وجہ سے میں نہیں جا سکا لیکن میرے عم زاد فصیح الدین کے ساتھ باقر علی .D.H.B کیلئے اندور چلے گئے۔ ان لوگوں کے Notes تیار کرنے کے دوران مجھے ہومیو پیتھی سے دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اور میں اس کا مطالعہ کرتا رہا۔ مَیں نے ۱۹۶۵ء میں ناگپور سے محکمہ صحتِ عامّہ کے تحت Vaccinator کی ٹریننگ پانے کے بعد سند حاصل کی۔ کچھ دنوں ملازمت کا سلسلہ رہا۔ ۱۶ر فروری ۱۹۶۹ء کو بمبئی کی طرف سفرِ ہجرت کیا۔ بمبئی میں مختلف ملازمتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ ادبی محافل میں شرکت کا موقعہ ملتا رہا۔ چھپنے کا بھی مشغلہ تھا۔ علامہ گنبدؔ کی وساطت سے انقلاب اور اردو ٹائمز کے دفتر تک رسائی تھی۔ ادبی شخصیات سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ خلافت ہاؤس سے بھی رابطہ رہا۔ آہستہ آہستہ ادبی مشاغل سے دوری ہوتی گئی۔ روزی روٹی کی دوڑ میں شاعری کے اظہار کی حیثیت ثانوی ہوکر رہ گئی۔ لیکن کہنے لکھنے اور داخلِ دفتر کرنے کا سلسلہ کبھی نہیں رُکا۔ طویل نظمیں بھی اسی بھاگ دوڑ کے دوران کہی گئی ہیں۔ ملازمت کی مصروفیت نیز شاعری کی مشغولیت کے ساتھ ساتھ ہومیو پیتھک میں مہارت حاصل کرنے کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ جزوقتی معالجہ کے تجربہ بھی حاصل کرتا رہا۔ ۱۷ر مارچ ۱۹۸۰ء کو والد حضرت کے طے کردہ رشتے کے مطابق آکولہ میں شادی ہوئی۔ اس رات ایک تاریخی ادبی نشست ہوئی جس میں منشاء الرحمٰن منشاءؔ، مردان علی خاں نشاطؔ کے علاوہ علامہ گنبدؔ بھی شریک تھے۔ جواُن کی آخری نشست تھی۔ اس طرح آکولہ میری سسرال کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ آکولہ کے مجھ پر کئی احسان ہیں۔ آکولہ سے مجھے زندگی کے سفر کا ساتھی ملا۔ تین ذہین بیٹوں کے ذریعہ میرا خاندان بنا۔ اور پھر یہ پھیلاؤ آگے بڑھا۔ آکولہ کے ادبی حلقے نے ہمیشہ میری پذیرائی کی۔ بالخصوص علامہ گنبدؔ، مردان علی خاں نشاطؔ، غنی اعجازؔ، فصیح اللہ نقیبؔ کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔
آکولہ قیام ہوتا تو غنی اعجازؔ صاحب کے دولتکدے پر نشست کا اہتمام ضرور ہوتا۔

فصیح اللہ نقیب بھی شرکت فرماتے اور سُننے سُنانے کا یہ سلسلہ رات دیر گئے تک جاری رہتا۔ ان محفلوں کی یاد گوشۂ دل میں ہمیشہ محفوظ رہیگی اس مجموعۂ کلام کی اشاعت کے سلسلہ میں شکیل اعجاز کی محنت شاقہ نے اربابِ آکولہ کے احسانات کو مزید گراں بار بنادیا ہے۔

۲۰۰۵ء تک ملازمت کا سلسلہ چلتا رہا۔دس برس ہوئے کہ ملازمت کو خیر باد کہہ کر ہومیوپیتھک طریقۂ علاج کے ذریعہ معالجہ کو ہمہ وقتی طور پر اپنائے ہوئے ہوں۔ چھیالیس برس سے بمبئی کی مصروفیت کے عذاب میں مبتلا مخلوق کی دوڑتی بھاگتی زندگی کا حصّہ بنا ہوا ہوں۔ یا یہ دوڑتی بھاگتی زندگی میرا حصّہ بن گئی ہے۔کلام کی طباعت کی طرف رغبت تھی نہ فرصت تھی کیونکہ میرا نظریہ تو یہ رہا ہے کہ ؂

دوام ادب میں دواوین سے نہیں ملتا
بس ایک شعر ہی کہہ لے کوئی ٹھکانے کا

میری زندگی کے سفر کو مختصر طور پر یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ زندگی کے سفر کی ابتدا دریچے (کھڑکیا) سے ہوئی۔آبائی وطن ایلچپور کے صحن و آنگن میں تعلیم و تربیت پانے کے بعد ایلچپور کا ایلچی بن کر باب الہند یعنی بمبئی آ گیا۔اب اسی دروازے سے زندگی کا ڈوبتا ہُوا سورج دیکھ رہا ہوں۔آپ سے درخواست ہے کہ اس گناہگار کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں۔جزاك الله فی الدّارین

شمع کی لو کا دھواں ہیں ہم سیہ بختانِ شب
روشنی ڈھونڈے گی ہم کو جب کہ کھو جائینگے ہم

وما توفیقی الا باللہ
احقر
سعید افسر

نظر خلاء میں بہت دور تک بھٹکتی ہے
نہ جانے کون سے آدم کی راہ تکتی ہے

ہمیں یہ غم کہ مآلِ بہار کیا ہوگا !
تمھیں خوشی کہ چلو بزم تو مہکتی ہے

سمیٹ لاتی ہے دل سے لہو کا ہر قطرہ
جو ایک بوند مری آنکھ سے ٹپکتی ہے

ہر ایک دل میں ہے تکمیلِ آرزو کی لگن
ہر ایک رات سویرے کی راہ تکتی ہے

سنہ ۱۹۶۲ء

گذر، گذار جیسے الفاظ کو گزر، گزار پڑھنے کی درخواست ہے ۔سعید افسر

رہ گذارِ شوق میں جب ساتھ وہ چلتے رہے
آنسوؤں کی آنچ میں بھی قہقہے ڈھلتے رہے

اے نسیمِ صبحِ عشرت کچھ تو کر ان کا ملال
وہ چراغِ شامِ غم جو صبح تک جلتے رہے

ہم سا پابندِ مزاجِ دوست کیا ہوگا کوئی
اس نے جس سانچے میں ڈھالا اس میں ہم ڈھلتے رہے

سایۂ دیوار نے آواز تو دی تھی مگر
جب مقدر ہی میں چلنا تھا تو ہم چلتے رہے

شمع کی مانند ہے افسؔر کی رودادِ حیات
شام سے روشن ہوئے اور صبح تک جلتے رہے

۱۹۶۲ء

اگر وہ زُلف شکن در شکن سنور جائے
رُخِ حیات پہ اِک چاندنی بکھر جائے

وہاں وہاں مری بربادیوں کا ماتم ہے
جہاں جہاں یہ تری چشمِ فتنہ گر جائے

ہر ایک موڑ پہ روشن کرو چراغِ وفا
کہ دل کی لاش اُجالوں کے دوش پر جائے

بُجھے نہ کوئی دِیا انتظار کی شب کا
نسیمِ صبح دَبے پاؤں یوں گذر جائے

تمام رات جلانا ہے خونِ دل افسرؔ
کہ "رنگِ صبح غزل" اور بھی نکھر جائے

ایلچپور ۱۹۶۲ء

شب کی سیاہیوں میں سلگتا رہا ہوں میں
اِک آس تھی سحر کی جو زندہ رہا ہوں میں

پتھر کی بے حسی مجھے ملتی تو خوب تھا!
انسان بن گیا ہوں تو پچھتا رہا ہوں میں

ماضی کی بھیڑ میں تمھیں کرتا رہا تلاش
تم جب سے گم ہوئے ہو بھٹکتا رہا ہوں میں

دنیا سمجھ رہی ہے رہا اُس کے ساتھ ساتھ
میرے خیال میں تو اکیلا رہا ہوں میں

افسرؔ ! خدا گواہ کہ اس شہرِ سنگ میں
اپنی ذہانتوں کی سزا پا رہا ہوں میں

ایلچپور ۱۹۶۷ء

تیرے عہدِ وفا کے بل پر طوفاں کو للکاریں کیا
اِن موجوں کو کاٹ سکیں گی یہ نازک پتواریں کیا

آنے والی رُت کا تصوّر بیتی ہوئی فصلوں کا خیال
اپنے دل میں سوچ رہی ہیں گرتی ہوئی دیواریں کیا

فرضِ محبّت کیسے ادا ہو ہم جیسے ناداروں سے
جان پرائی دامن خالی آخر اس پر واریں کیا

راہِ وفا پر چل تو پڑے ہو لیکن رُک کر سوچو تو!
اِن ہاتھوں سے توڑ سکو گے پتھر کی دیواریں کیا

بازی گاہِ شوق میں افسرؔ ہم تو کھڑے یہ سوچے ہیں
اپنی گرہ میں رکھا کیا ہے، جیتیں کیا اور ہاریں کیا

۱۹۶۷ء

حدیثِ جام چلے قصۂ سبو نکلے
کسی بھی طرح سہی تیری گفتگو نکلے

میں تیشہ زن ہوں ترے واسطے یہی بس ہے
یہ آرزو ہی کیے ہے کہ آرزو نکلے

نہ جانے کیوں مرا لہجہ بدلنے لگتا ہے
جو دوستوں میں کبھی تیری گفتگو نکلے

دلوں کی بات بھی نکلی نسیمِ آوارہ
ہمارے عشق کے قصّے بھی کوبکو نکلے

یہ جانتے ہیں کہ تو شہر میں نہیں ہے مگر
ہے پھر بھی آس کسی موڑ پر سے تو نکلے

دلِ گداز کا کرتا ہوں احترام اتنا
مَیں چوم لیتا ہوں جس آنکھ سے لہو نکلے

خدا کے فضل سے مَیں کم ہنر نہ تھا افسرؔ
ستم تو یہ ہے کہ احباب عیب جو نکلے

۱۹۶۸ء

خوشی کی چند کڑیوں سے بنا کیا
کہیں ٹوٹا غموں کا سلسلہ کیا

رگڑیئے اپنی پیشانی کہاں تک
مٹے گا اپنی قسمت کا لکھا کیا ؟

مَیں کیوں اپنا سراپا دیکھتا ہوں
کوئی گذرا ہے مجھ کو دیکھتا کیا

ہے آخر وضعداری بھی کوئی شئے
سرِ راہے وہ ہم سے پوچھتا کیا

وہ کانٹے راستے پر اب نہیں ہیں
زمانہ راستے پر آگیا کیا!

وہاں لُٹنے گئے تھے لُٹ کے آئے
زمانہ پوچھتا ہے کچھ مِلا کیا ؟

شعاعِ مہر کی ہے دیر افسرؔ
بساطِ قطرۂ شبنم بھلا کیا

۱۹۶۸ء

شعلۂ گل سے رنگِ شفق تک عارض ولب کی بات گئی
چھڑ گیا جب بھی تیرا قصّہ، ختم ہوا دن، رات گئی

سوکھے ہونٹ تو بوند کو ترسے مینا خالی جام تہی
لیکن پھر بھی چند لبوں تک ساقی کی سوغات گئی

سرگوشی میں بات جو کی تھی کیا تھی ہم خود بھول گئے
لیکن ایک فسانہ بن کر دنیا تک وہ بات گئی

یادوں کے زہریلے نشتر ٹوٹ رہے ہیں رَگ رَگ میں
برسا کر کچھ ایسے شعلے اب کے برس برسات گئی

سِسکی اِک مجبور دُلھن کی ذہن میں اُبھری رہ رہ کر
شہنائی کی گونج میں افسؔر جب بھی کوئی بارات گئی

۱۹۶۸ء

کل اگر سمجھ لیتے وقت کی ضرورت ہم
آج یوں نہ منہ تکتے آئینے کی صورت ہم

یہ دلِ گداز اپنا اور دھوپ فکروں کی
کس جگہ اُٹھا لائے برف کی یہ مورت ہم

بھول کر زمانے کی تلخ تر حقیقت کو
آؤ ! دیکھ لیں کوئی خواب خوبصورت ہم

نفرتوں کی آیت سے پُر ہے لوحِ پیشانی
دھو سکیں گے کیا یارو قلب کی کدورت ہم

دشمنوں سے کرتے ہیں بات نرم لہجے میں
پتھروں کو چھوتے ہیں آئینے کی صورت ہم

جنسِ بے ضرورت تھے وقت کی نگاہوں میں
اُٹھ گئے تو بن بیٹھے وقت کی ضرورت ہم

جانے کب ملے افسؔر سنگِ نا تراشیدہ
جانے کب بنائیں گے اِک حسین مورت ہم

۱۹۶۸ء

دھوپ کو گرم نہ کہہ سایۂ دیوار نہ دیکھ
تجھ کو چلنا ہے تو پھر وقت کی رفتار نہ دیکھ

میری فکروں سے اُلجھ مجھ کو سمجھنے کے لئے
دور سے موج میں اُلجھی ہوئی پتوار نہ دیکھ

ان کی روحوں کو پرکھ آدمی ہیں بھی یا نہیں
صرف صورت پہ نہ جا جبّہ و دستار نہ دیکھ

اپنے آنگن ہی میں کر فکرِ نموئے گلشن!
کوئی جنّت بھی اگر ہے پسِ دیوار نہ دیکھ

اِن دمکتے ہوئے لمحات کے جادو سے نکل!
وقت کی چال سمجھ شوخئ رفتار نہ دیکھ

غم سے لڑنا ہے تو پھر غمزدہ صورت نہ بنا
زندہ رہنا ہے تو مُردوں کے یہ اطوار نہ دیکھ

میرے نغمات کو تفریح کے کانوں سے نہ سُن
رقص کی پیاس ہے آنکھوں میں تو پیکار نہ دیکھ

قدردانی کو مراتب کے ترازو میں نہ تول
کون افسؔر ہُوا یوسف کا خریدار نہ دیکھ

۱۹۶۸ء

قلبِ شاعر پہ کوئی کوہِ گراں ٹوٹا ہے
آس ٹوٹی ہے کہ پھر رشتۂ جاں ٹوٹا ہے

اب تو راہوں میں سہارے کی ضرورت تھی ہمیں
سلسلہ پیار کا ٹوٹا تو کہاں ٹوٹا ہے

تم چلاتے رہو پتھّر تمھیں احساس ہی کیا
کون سے موڑ پہ کب کس کا مکاں ٹوٹا ہے

پھر کوئی چبھتی ہوئی بات کہی ہے تم نے
پھر کوئی تیر قریبِ رگِ جاں ٹوٹا ہے

کس متانت سے گری برق جمالِ جاں سوز
کس عقیدت سے مرا قلبِ تپاں ٹوٹا ہے

کتنے افسوں تھے پڑھے ڈوبتی کرنوں نے مگر
یہ طلسمِ شبِ ظلمات کہاں ٹوٹا ہے

آج افسؔر کو بھی ہنستا ہُوا دیکھا ہم نے
بختِ خفتہ کیا ترا خوابِ گراں ٹوٹا ہے

۱۹۶۸ء

آس کے ساتھ یاس رہتی ہے
ہر خوشی کچھ اُداس رہتی ہے

ہیں بناوٹ کے سینکڑوں پردے
سادگی بے لباس رہتی ہے

تم چلے جاؤ گے تو سوچیں گے
کیوں طبیعت اُداس رہتی ہے

جانتے ہیں کہ تم نہ آؤ گے
پھر بھی کم بخت آس رہتی ہے

روشنی میرے گھر نہیں افسرؔ
ہاں کہیں آس پاس رہتی ہے

ایلچپور ۱۹۶۸ء

آگ تھی دل میں شگوفے مری گفتار میں تھے
کیسے اُلجھے ہوئے پہلو مرے کردار میں تھے

موت کی دھوپ جو پھیلی ہے تو یہ بات کھُلی
کچھ حسیں خواب ابھی دیدۂ بیمار میں تھے

کھیت کی جلتی ہوئی فصل بچاتا بھی تو کون
لوگ تو بکھرے ہوئے شہر کے بازار میں تھے

نغمۂ عیش کی لے ختم ہوئی ماتم پر
شام کے رنگ نئی صبح کے آثار میں تھے

سچ تو یہ ہے کہ تری یاد نے سونے نہ دیا
نیند کے خط تو کئی دیدۂ بیدار میں تھے

دھوپ میں ہم پہ جو گزری وہ تمھیں کیا معلوم
تم تو اوروں کی طرح سایۂ دیوار میں تھے

اب سکوں بخش ہیں اس شہر کی یادیں افسرؔ
ہم جہاں جکڑے ہوئے درد کے آزار میں تھے

جنوری ۱۹۶۹ء

کچھ نہ کہنے کی قسم کھا کے چلی ہو جیسے
آپ کی یاد بھی منھ بند کلی ہو جیسے

کوئی آہٹ ہے نہ دستک نہ کسی گیت کی لَے
دِل نہ ہو گاؤں کی سنسان گلی ہو جیسے

میرے بالوں کے بکھرنے سے تو یوں لگتا ہے
یہ ہَوا بھی ترے آنگن سے چلی ہو جیسے

شکوۂ تشنہ لبی ہے نہ غمِ تنہائی
زندگی درد کے صحرا میں پلی ہو جیسے

وہ لپک ہے ترے لہجے میں کہ پتھر پگھلے
سوزِ دل میں تری آواز ڈھلی ہو جیسے

یاد رکھنے کی قسم کھائی ہو جیسے سب نے
بھول جانے کی کوئی رسم چلی ہو جیسے

خودنمائی نے تو صورت ہی بدل دی افسرؔ
ہر فقیر اپنی جگہ کوئی ولی ہو جیسے

۱۹۶۹ء

جینے پہ جو اُکسائے وہ اُلجھن بھی نہیں ہے
اس شہر میں میرا کوئی دشمن بھی نہیں ہے

سوکھے ہوئے کچھ پھول نہ پگھلی ہوئی شمعیں
اللہ وہ صحرا کہ جو مدفن بھی نہیں ہے

ہمسائے کی صورت کوئی دیکھے بھی تو کیوں کر
دیوار وہ حائل ہے کہ روزن بھی نہیں ہے

اب اپنا جنازہ لئے بازار میں گھومو!
جاؤ گے کہاں شہر میں مدفن بھی نہیں ہے

ڈھونڈوں تو کہاں کھوئے ہوئے ذہن کو افسرؔ
ہاتھوں میں مرے سوچ کا دامن بھی نہیں ہے

۲۳ اپریل ۱۹۶۹ء ، بمبئی

سب سے الگ تھی اپنی طبیعت، سب سے الگ دنیا میں رہے ہم
جس کو چاہا ٹوٹ کے چاہا، جس سے روٹھے پھر نہ ملے ہم

آئینے کو سامنے رکھ کر پہروں سوچا کرتے ہیں
لوگ جو اب پہچانتے کم ہیں کیا ایسے تبدیل ہوئے ہم

جب سے ہم نے شہر کو چھوڑا، کیا گزری کچھ نہ پوچھو
نام کسی کا یاد رہا تھا اب تو وہ بھی بھول گئے ہم

کیا کیا چہرے ساتھ تھے افسرؔ سونی سونی گلیوں میں
ہنگاموں کے شہر میں آ کر تنہا تنہا بھٹکے ہم

۳۰ جون ۱۹۶۹ء، بمبئی

کچھ لوگ ایک وضع کے پابند ہو گئے
اپنے تئیں زمیں کے خداوند ہو گئے

افعال سامنے ہیں انھیں دیکھ لیجیے
اقوال ! اِک کتاب میں تھے بند ہو گئے

دستارِ علم و فضل کے ٹکڑے بھی اب کہاں
وہ تو پھٹی قمیص کا پیوند ہو گئے

کیا لوگ تھے جو صرف صداقت کے نام پر
اپنی تباہیوں پہ رضا مند ہو گئے

افسرؔ جو لوگ کل تھے اصولوں کی راہ پر
اونچی عمارتوں میں کہیں بند ہو گئے

۳؍جولائی ۱۹۶۹ء

فصیلِ حرف و بیاں کیوں بھلا دِکھائی دے
دِلوں کی بات اگر آنکھ سے سُنائی دے

کبھی تو ایسا لگے جیسے بھوک ہار گئی
کبھی تو سارے گھروں سے دھواں اُٹھائی دے

دِلوں کو مہر سے نا آشنا نہ رکھ یارب
کسی کے پاس اگر کاسۂ گدائی دے

کھڑا ہوا ہوں گذرتے ہوئے جلوس کے پاس
کہ کوئی شکل تو دیکھی ہوئی دِکھائی دے

بجا یہی کہ سنو وہ جو لوگ کہتے ہیں
مگر کبھی تو خود اپنی صدا سُنائی دے

اگر یہ لوگ خلوص آشنا نہیں ہیں تو پھر
مرے خدا مری فطرت میں کج ادائی دے

بڑے فریب ہیں اس خوش نمائی میں افسرؔ
بھلا یہی ہے کہ دنیا بُری دِکھائی دے

۱۳ اگست ۱۹۶۹ء

زباں کھولیں یہ اپنی خو کہاں ہے
سمجھ لے خود ہی ایسا تو کہاں ہے

لڑو گے کس طرح جنگِ صداقت
نِری تلوار ہے بازو کہاں ہے

بھلا حالات کیا قابو میں آئیں
خود اپنی ذات پر قابو کہاں ہے

یہ دنیا تو انانیت میں گم ہے
یہاں تو مَیں ہی مَیں ہے تُو کہاں ہے

تمھارے ہاتھ میں گل ہے مَسل دو
تمھاری قید میں خوشبو کہاں ہے

ترے ادراک میں سب کچھ ہے افسرؔ
ترے ادراک میں خود تو کہاں ہے

۲۰ر اکتوبر ۱۹۶۹ء

اس بیاباں میں کوئی ساتھی کہاں پائیں گے ہم
راستو ! آؤ اکیلے ہی چلے جائیں گے ہم

گھر کا آنگن اب صدائیں دے رہا ہے کس لئے
جب بگولہ بن کے نکلے ہیں تو کیا آئیں گے ہم

لمحہ لمحہ توڑتا ہے جسم کے اہرام کو
ریزہ ریزہ ہو کے جانے کب بکھر جائیں گے ہم

پیاسی آنکھو ! صبح کے سورج نے تم کو کیا دیا
آؤ تم کو رات بھر کچھ خواب دکھلائیں گے ہم

شمع کی لو کا دھواں ہیں ہم سیہ بختانِ شب
روشنی ڈھونڈے گی ہم کو جب کہ کھو جائیں گے ہم

۱۶ر فروری ۱۹۷۰ء

فکر کی حدّت سے اپنا جسم گرمائے رکھو
گتھیاں سلجھیں نہ سلجھیں خود کو اُلجھائے رکھو

لوگ چہرے کے تاثّر کو کریدیں بھی تو کیا
درد کو تم حافظے کی تہہ میں دفنائے رکھو

اے قلم کارو! زمیں پر تو دُکانیں کھُل گئیں
اب سمندر کی تہوں میں اپنے سرمائے رکھو

گھر کے فاقوں کی کہانی چوک تک آنے نہ دو
ایک چادر سی دھوئیں کی چھت پہ لہرائے رکھو

آدمی مصروف ہوتا جارہا ہے دن بہ دن
اپنے ہاتھوں سے تم اپنی لاش کفنائے رکھو

تپتا سورج چھین لیتا ہے بصارت دوستو!
اپنی آنکھوں پر تم اپنی سوچ کے سائے رکھو

۲۴ رمئی ۱۹۷۰ء

ان کی قبائے زر انھیں کیا کیا بنا گئی
اپنی پھٹی قمیص ہنر کو بھی کھا گئی

اے عمر تیز گام یہ کیا ہوگیا تجھے
تو بھی خیال وخواب کی باتوں میں آ گئی؟

راہِ طلب تو پہلے ہی دشوار تھی اور اب
اِک آخری امید بھی رستہ دِکھا گئی

کانٹوں کی چھیڑ چھاڑ میں خوں کا زیاں ہُوا
پھولوں کی دیکھ بھال میں بو ہاتھ آ گئی

راہوں کی اونچ نیچ سے آئی سبک روی
موجوں کی ریل پیل کنارے لگا گئی

موضوعِ گفتگو بنی افسرؔ مری ہنسی
گُل کی شگفتگی بھی کئی گُل کھِلا گئی

۳؍جون ۱۹۷۰ء

کب ڈھلتی ہے چہرے سے یہ گردِ سفر پوچھو
آوارہ ہواؤں سے موسم کی خبر پوچھو

پھر لوگ بناتے ہیں تعمیر کا منصوبہ
مِٹ جائیں گے نقشہ سے کیا اور بھی گھر پوچھو

کہنے کو تو کہہ دینگے احوال زمانے کا
اور خود سے بھی غافل ہیں سچ بات اگر پوچھو

مشہور ہو تم کتنے معلوم تو ہوجائے
چوراہے پہ رُک جاؤ اور اپنا ہی گھر پوچھو

بوسیدہ کتابوں میں کیا ڈھونڈتے ہو افسرؔ
جلتی ہوئی آنکھوں سے دنیا کی خبر پوچھو

۱۵؍جون ۱۹۷۰ء

مری شکست میں میرا بھی تھوڑا ہاتھ رہا
کہ شہرِ سنگ میں کیوں آئینہ صفات رہا

تم ایک لحظہ بھی میرے قریب آ نہ سکے
مَیں خود کو چھوڑ کے صدیوں تمھارے ساتھ رہا

ہم اپنے واسطے میزان لے کے بیٹھے تھے
تمام عمر یہاں احتسابِ ذات رہا

وہ شخص کتنا بھلا تھا جو زندہ رہ کر بھی
بلند تر بہ رسومِ تکلّفات رہا

مرے مزاج کے ٹھیراؤ پر نہ جاؤ تم
مَیں اپنی موج میں ایک سیلِ حادثات رہا

مَیں کائنات کا قیدی نہیں رہا افسرؔ
مَیں اپنے آپ میں خود ایک کائنات رہا

۱۵ر جون ۱۹۷۰ء

کمالِ صبح زوالِ سیاہئ شب ہے
خیالِ یار سلامت ملالِ غم کب ہے

مجھے بتاؤ مذاہب کے ماننے والو !
جو ظلم کرنا سکھائے وہ کوئی مذہب ہے

سحر کی دھوپ میں کب سے نہا رہے ہو مگر
تمھارے ذہن میں اب تک بھی ظلمتِ شب ہے

یہ آسمانی کتابیں ہیں آدمی کے لئے
تم آدمی جسے کہتے ہو آدمی کب ہے

کوئی مزاج بھی پوچھے تو سوچئے رُک کر
کہ اس خلوص کا آخر کوئی تو مطلب ہے

نمود و نام کے خواہاں نہیں ہیں ہم یعنی
ہمارا نام ہی افسرؔ نشانِ منصب ہے

۷ / جولائی ۱۹۷۰ء

نہیں ثبات پہ قائم کمال آمادہ
عروجِ ماہ بھی نکلا زوال آمادہ

وہ میری سمت بڑھا کیسی کشمکش لیکر
زباں تھی عذر طلب اور خیال آمادہ

زمانہ تیغ اُٹھاتا ہے سر جھکانے پر
یونہی نہیں کوئی ہوتا قتال آمادہ

بہ زعمِ علم تمھاری زباں نہیں کھلتی
یہاں تو سنگ بھی رہتے ہیں قال آمادہ

غم و خوشی کے مطالب بدل گئے افسرؔ
جو خوش نصیب تھے اب ہیں ملال آمادہ

۷ رجولائی ۱۹۷۰ء

جہانِ شوق میں ہم غم سے نیم جاں نہ رہے
لپکتا تیر رہے ٹوٹتی کماں نہ رہے

فرازِ کوہ پہ برسے برنگِ ابر مگر !
چراغِ بزم کا دم توڑتا دھواں نہ رہے

بگولہ بن کے بھٹکتے پھرے جہاں بھر میں
غریبِ شہر بنے قیدیٔ مکاں نہ رہے

یہ لوگ چند گھروندوں میں گھر گئے اور ہم
تمام دہر پہ چھائے رہے کہاں نہ رہے

حیات سخت و گراں بار تھی مگر ہم نے
یہ بوجھ ایسے اُٹھایا کہ سرگراں نہ رہے

ترا وجود مرے واسطے ضروری ہے
مَیں کیا رہوں گا اگر تو قریبِ جاں نہ رہے

۱۱ر جولائی ۱۹۷۰ء

نظر مکن بحقارت شکوہِ سلطانی
چہ عزّ و مرتبہ داریم تو نمی دانی

اسی کے سامنے جھکتی ہے اپنی پیشانی
تمام کون و مکاں پر ہے جس کی سلطانی

ہمارے پاس یہ دولت جو ہے تو کیا کم ہے
شکستہ دل نہیں کرتی شکستہ سامانی

لبِ فرات ٹہلتے ہیں تشنہ لب لیکن
کسی یزید سے ہم مانگتے نہیں پانی

تری سمجھ میں نہ آئے گا وصفِ صبر و غنا
کہ تیرے خون میں شامل ہے مرثیہ خوانی

کسی بھی دام پہ بکتی نہیں زباں اپنی
کسی دباؤ سے جھکتی نہیں یہ پیشانی

تو اپنے آپ کو جنسِ گراں بہا نہ سمجھ
ہماری آنکھ سے تو دیکھ اپنی ارزانی

یہ خاکساری ہمارا مزاج ہے افسرؔ
وہ خاک ہیں جو بناتی ہے کاخِ سلطانی

۱۱ر جولائی ۱۹۷۰ء

شرحِ اسلوب یا تشریحِ معانی کیا ہے
دل میں سیدھی جو نہ اُترے تو کہانی کیا ہے

مُردہ دل کو نہ پڑھا جہدِ مسلسل کا سبق
اندھی آنکھوں سے نہ کہہ شام سُہانی کیا ہے

سادہ لوحی نہ کہو جرم ہے یہ کم نظری
وہ جو تالاب سے پوچھے کہ روانی کیا ہے

ہم ہی خود ریت کی مانند بکھر جاتے ہیں
ورنہ اپنے لئے موجوں کی روانی کیا ہے

ہم تو اِک شاخ کا ٹوٹا ہوا پتا ٹھیرے
اپنا ورثہ ہی بھلا کیا ہے نشانی کیا ہے

غیر کی عقل نہ لو مجھ کو سمجھنے کیلئے
اپنی آنکھوں سے پڑھو میری کہانی کیا ہے

ہم کو بھی کھا گیا اس عہد کے یاروں کا خلوص
زخمِ سر دیکھ لو اب اور نشانی کیا ہے

اس کو قصہ نہ کہو ہم پہ جو بیتی یارو!
تم پہ پڑتی تو سمجھتے کہ کہانی کیا ہے

۱۹۷۱ء

کشاکشِ غمِ لیل و نہار سے نکلیں
ہو ختم عمر تو اس کربِ زار سے نکلیں

طلسم خود نگری توڑ کر تو باہر آ
تو ہم بھی اپنی انا کے حصار سے نکلیں

ہمارے عکس میں دھندلاہٹیں ہیں ماضی کی
غبار دل کا چھٹے تو غبار سے نکلیں

وہاں بھی سخت مسائل کا سامنا ہوگا
تو کس امید پہ اس ریگزار سے نکلیں

ہم اپنی حد سے تجاوز تو کر نہیں سکتے
حضور آپ ہی قیدِ وقار سے نکلیں

سمجھ لو ذوقِ ادب پر معاش حاوی ہے
جریدے شہر میں جب اشتہار سے نکلیں

۱۹۷۱ء

نمودِ حسن کی خاطر نقابِ رُخ نہ اُتار
بگاڑ دیتا ہے چہرے کو راستے کا غبار

ہزار درجہ عزیزوں کے پیار سے بہتر
دیارِ غیر میں اِک اجنبی نظر کا دُلار

کسی کے عیب گنانے کا وقت ہی کب ہے
مَیں کر رہا ہوں ابھی اپنی لغزشوں کا شمار

اِدھر یہ چھوٹ کہ سب نیک و بد کا مالک ہوں
اُدھر یہ جبر کہ مرضی مری ہے دم بھی نہ مار

نمودِ عیب ہنر بن گیا زمانے میں
چھپایا جاتا ہے شیشے سے رخنۂ دیوار

تو نسلِ نو کو نہ دے کوئی قرض ورثے میں
جو ہو سکے تو کئی پیڑھیوں کا قرض اُتار

خدا کے واسطے تجدیدِ دوستی نہ کرو
دھلا نہیں ہے اگر دل سے نفرتوں کا غبار

کوئی عزیز ہو یا عمرِ رفتگاں افسرؔ
جو تجھ کو چھوڑ گیا ہو اُسے کبھی نہ پکار

احساس کی موجوں کو سمیٹے ہی رہیں کیا ؟
سُننے کو نہ ہو کوئی تو ہم کچھ نہ کہیں کیا ؟

لہجے کے دِیے زخم ہی بھرنے نہیں پائے
ناخن سے کریدو گے ابھی دل کی تہیں کیا ؟

خوشبو کی طرح کیوں نہ بکھر جائیں فضا میں
دُنیا ہے اگر تنگ تو ہم قید رہیں کیا ؟

دل رکھنا الگ بات صداقت ہے الگ چیز
ہم برق کو بھی برف مروّت میں کہیں کیا ؟

بازار میں سب لوگ ہی عریاں ہیں تو افسرؔ
ہم جامۂ اخلاق لپیٹے ہی رہیں کیا ؟

۱۳ اگست ۱۹۶۹ء

اِک ذرا ہم جو بڑھے اپنی انا کے آگے
تو ہی موجود مِلا کلمۂ لا کے آگے

حرف آوارہ و دریوزہ گرِ شہر ہوئے
کون سُنتا ہے یہاں اپنی صدا کے آگے

کب پڑے سنگِ ملامت یہ ہمیں ہوش کہاں
ہم تو ششدر تھے کھڑے اپنی خطا کے آگے

بس اسی ایک روایت کے یقیں پر ہے سفر
ہے خیابانِ جزا دشتِ بلا کے آگے

جسم اِستادہ رہے روح سے خالی ہی سہی
کام ہوتا ہے سلیماں کے عصا کے آگے

لَوٹ آئے تھے درِ کعبہ سے جو لوگ افسرؔ
دست بستہ وہ ملے اپنی انا کے آگے

۱۹/ اکتوبر ۱۹۷۷ء

وہ دیکھنے میں بظاہر بہت ہی سادہ تھا
مگر کبھی نہ کھلا اس کا کیا ارادہ تھا

معاملات میں افلاس کھل گیا اس کا
تکلّفات میں جب تک تھا شاہزادہ تھا

شکستہ پا تھے مگر ہم شکستہ دل نہ ہوئے
نگاہ میں وہی طوفاں طلب ارادہ تھا

جو لوحِ فکر پہ اُبھرا تو کائنات بنا
دماغِ تنگ میں جب تک تھا حرف سادہ تھا

یوں موجِ نیل میں ڈوبا کہ اب نشاں بھی نہیں
وہ شخص اپنے تئیں آفتاب زادہ تھا

اسی نے موجِ بلا کو غضب کی دعوت دی
تمھارے پاس جو سہما ہُوا ارادہ تھا

اگر وہ صیدِ ہوس تھے تو تم شکار طلب
ہوا کا زور کہیں کم کہیں زیادہ تھا

۲۸ر اکتوبر ۱۹۷۷ء

کشش زوال میں کھینچے تو پھر کہاں کا کمال
سنبھال خود کو فضاؤں میں اس قدر نہ اُچھال

کسے نصیب تھی فرصت کہ پوچھتا احوال
ہم اپنی فکر میں غلطاں وہ اپنے غم سے نڈھال

چلو کہ ختم ہُوا گہرے پانیوں کا سفر !
بس اب سمٹنے ہی والا ہے ماہی گیر کا جال

جو ہوگی صبح تو دروازے کُھلتے جائیں گے
فصیلِ ذہن پہ تو رات میں کمند نہ ڈال

دئے بغیر یہاں ہاتھ کچھ نہیں آتا !
مَیں تیری قبر بناؤں تو میری لاش سنبھال

وہاں کسی کے جھکائے بھی سر نہیں جھکتا
پہاڑ بن کے کھڑا ہو جہاں انا کا سوال

پڑا تھا معرکہ جیسا تو ویسے لوگ بھی تھے
کسی کی سانس تھی خنجر کسی کی پشت تھی ڈھال

نکل گئی ہے تری عمر فکرِ دنیا میں
جو ہو سکے تو مرے واسطے بھی وقت نکال

۲۶ر فروری ۱۹۸۰ء

گرتے گرتے بھری اُڑان بہت
ٹوٹتے جسم میں تھی جان بہت

بولتا تھا وہ بے تکان بہت
رفتہ رفتہ چلی دُکان بہت

مَیں زمیں سے ہزار بار اُٹھا
پھر بھی اونچا تھا آسمان بہت

زخم تو سوکھ بھی چُکا لیکن
درد دیتا ہے اب نشان بہت

آزمائش میں خود نہیں پڑتے
لوگ لیتے ہیں امتحان بہت

تم تھے موجود اوّل و آخر
ساری مشکل تھی درمیان بہت

ڈھونڈنے سے بھی وہ نہیں ملتا
شہر میں اس کے ہیں مکان بہت

سب شکاری ہیں شہر میں افسرؔ
ہیں لگے راہ میں مچان بہت

۱۱؍اپریل ۱۹۸۰ء

بجز سنگ و خزف وزنِ گہر کیا
نگاہِ نقد ہو تو نقد و زر کیا

سبھی ہیں تنگ دل کوتاہ قامت
کرے انساں کسی کے دل میں گھر کیا

بہت جی خوش ہُوا اِک بار مِل کر
ملیں دنیا سے ہم بارِ دگر کیا

تنفّس ہے کہ اِک کربِ مسلسل
اسے کہتے ہیں عمرِ مختصر کیا

پہاڑوں پر اُترنے کو ہے سورج
نہ ہوگا ختم یہ اپنا سفر کیا

نئی تہذیب زندہ ہو رہی ہے
ٹھکانے لگ ہی جائے گا بشر کیا

جھروکے کھڑکیاں بھی لازمی ہیں
فقط دیوار سے بنتا ہے گھر کیا

سکوں کے واسطے مرتا ہے انساں
سکوں ملتا ہے انساں کو مگر کیا

صدائیں آج بھی لبیک کی ہیں
وہ اِک آواز تھی معجز اثر کیا

اندھیرا جب نظر پر چھا گیا ہو
تو سورج ہاتھ پر آئے مگر کیا

متاعِ جاں گنوا کر سوچتے ہیں
مگر وہ دُزد تھا، صاحب نظر کیا

تری ہمسائیگی کام آگئی ہے
وگرنہ تھا زمانے سے مفر کیا

۶ جنوری ۱۹۷۹ء

مَیں گئے لمحوں کا باشندہ ہوں اتنا یاد ہے
وہ گیا لمحہ نہ جانے اب کہاں آباد ہے

ایک قبرستان کے جیسا ہمارا جسم ہے
زخم کے نیچے پرانا زخم بھی آباد ہے

کس طلسمی شہر میں لے آئی یہ پاگل ہَوا
ایک عالم ھُو کا ہے آدم نہ آدم زاد ہے

یہ جو ہے کچھ بھی نہیں، جو کچھ نہیں سب کچھ ہے وہ
ہست مِٹنے کے لئے ہے اور عدم آباد ہے

خواہشیں آسیب بن کر آدمی پر ہیں سوار
شاد جس کو کہہ رہے ہیں اصل میں ناشاد ہے

شہر تو ویراں ہوئے اس گرمیٔ بازار میں
عاشقِ مجنوں صفت سے دشتِ غم آباد ہے

ہلکی ہلکی سی پھواریں نرم جھونکے پیڑ کے
کس سُہانی رُت میں گھر چھوڑا تھا اب تک یاد ہے

تم سبق سیکھو نہ سیکھو گے سبق بن جاؤ گے
یاد رکھو وقت استادوں کا بھی اُستاد ہے

۱۹۷۹ء

کوئی کیا راہ دِکھلاتا مجھے بھی
سمجھتا خود تو سمجھاتا مجھے بھی

دلِ شہرت طلب دوکانِ زر میں
جو بس چلتا تو بیچ آتا مجھے بھی

جدائی میں یہ صدمہ ماسوا تھا
وہ چہرہ بن کے یاد آتا مجھے بھی

ہَوا کے دوش پر پھرتی ہے خوشبو
کوئی جھونکا سُلا جاتا مجھے بھی

مَیں گذری رُت کی بپتا بھول جاتا
نیا موسم جو راس آتا مجھے بھی

مرا شیطان مجھ پر منحصر تھا
بہکتا مَیں تو بہکاتا مجھے بھی

کوئی آئینہ رو ہوتا جو افسرؔ
مرا چہرہ نظر آتا مجھے بھی

۱۹۷۹ء

کوئی اندیکھا بھی شامل ان ملاقاتوں میں تھا
مَیں نے کب سوچا کہ مَیں تو گُم تری باتوں میں تھا

موجِ خوں مسجد کے مینارے بہا کر لے گئی
آدمی تھا بھی تو مستغرق مناجاتوں میں تھا

رفتہ رفتہ گھر کے دروازوں کو دیمک کھا گئی
اور وہ مصروف بے مصرف ملاقاتوں میں تھا

اب یہ عالم ہے کہ خود کہتا ہوں خود سُنتا ہوں مَیں
اوّل اوّل محو اِک عالم مری باتوں میں تھا

بیٹھے بیٹھے جسم ہی مفلوج ہو کر رہ گیا
کس قدر اندھا یقیں اس کو کراماتوں میں تھا

پاس کچھ حکمِ الٰہی کا تھا کارِ خیر میں
ہاتھ جذبِ خودنمائی کا بھی خیراتوں میں تھا

۱۵ مارچ ۱۹۷۹ء

وہ کہہ رہا ہے کہ سب کچھ ہے اختیار مجھے
تو اپنے آپ میں رہ کر کبھی پکار مجھے

زمینِ دشتِ یقیں پر قدم نہیں جمتے
اُڑائے پھرتا ہے ذہنِ خرد شکار مجھے

یہ خونِ پائے طلب ہے کہ کشتِ لالہ و گل
بہشت لگتا ہے صحرائے بے کنار مجھے

مَیں خواہشات کے پھندوں سے خوب واقف تھا
پکڑ سکی نہ زمانہ کی گیر و دار مجھے

زمیں کی سطح سے ملتی ہے آبلہ پائی
اے چشمِ آب طلب چاہ میں اُتار مجھے

مَیں اپنا قرض زمانے پہ چھوڑ جاتا ہوں
مِلا تھا اپنے بزرگوں سے کچھ اُدھار مجھے

۱۰ فروری ۱۹۷۹ء

پھر وہ دستک ہوئی دیکھنا کون ہے
اور اس کے سوا مشغلہ کون ہے

خود فریبی کی اب انتہا کون ہے
آدمی پوچھتا ہے خدا کون ہے

ڈھا چکے گھر کی دیوار تب یہ کھلا
اپنا ہمسایہ اپنے سوا کون ہے

نامور ہی نہیں پھر ہنر کیا کریں
شہر میں آپ کو پوچھتا کون ہے

تیرے بارے میں اے زندگی بیٹھ کر
سوچنا چاہئے ، سوچتا کون ہے

۱۱رفروری ۱۹۷۹ء

زیاں و سود کا یہ کاروبار ایسا ہے
سلوکِ دوست بھی اب تو اُدھار ایسا ہے

بسی ہے ذہن میں خوشبو نظر میں کچھ بھی نہیں
وجود اس کا ہوائے بہار ایسا ہے

کسی کا چہرہ برابر نظر نہیں آتا
تمام شہر میں گرد و غبار ایسا ہے

یہاں سے حکم ہو ہجرت کا کچھ بعید نہیں
کہ دارِ امن میں اب انتشار ایسا ہے

مکاں بچے تو غنیمت، ثمر کی آس کہاں
شجر نصیب سے بے برگ و بار ایسا ہے

غبار بن کے بھٹکتا تو کچھ بھلا لگتا
وہ شخص ساکت و صامت مزار ایسا ہے

شکیب و صبر کہاں تک، یہاں کا ہر پیکر
ہوس بڑھاتے ہوئے اشتہار ایسا ہے

۱۵ فروری ۱۹۷۹ء

پابندِ جسم و قد ہو تو پیکر دِکھائی دے
محدود جو نہیں ہے وہ کیونکر دِکھائی دے

اسرارِ خوش مذاقئ انساں کھلیں اگر
دیوارِ قہقہہ میں کوئی در دِکھائی دے

نسلوں کا خون صرف ہُوا اس اُمید پر
شائد کہ یہ مکان کبھی گھر دِکھائی دے

پانی کی سطح پر رہا کرتے ہیں بلبلے
تہہ میں اُتر تو کوئی شناور دِکھائی دے

طاری نہ ہو جمود یہ تسلیم ہے مگر
یہ کیا کہ شہر عرصۂ محشر دِکھائی دے

تعمیر تاج محل ہو یہ کیا ضرور ہے
جذبہ ہی عاشقی کا اجاگر دِکھائی دے

۱۱رفروری ۱۹۷۹ء

مزاجِ نو میں یہ اِک اشتعال کیسا ہے
ہے اصل خاک تو آتش مثال کیسا ہے

سیاہ پڑ گئے چہرے عجیب دہشت ہے
گہن میں آ گیا سورج یہ سال کیسا ہے

خدا کو بھی جو نہ چھوڑے ہمارا ذکر ہی کیا
یہ بندہ ہائے خدا باکمال کیسا ہے

کئی برس ہوئے کوئی خبر نہیں افسؔر
وطن میں حلقۂ پُرسانِ حال کیسا ہے

۱۳ اگست ۱۹۶۹ء

باتوں باتوں میں وہ بھی پھوٹ گیا
شخصیت کا طلسم ٹوٹ گیا

مسئلے کل جو تھے وہی اب ہیں
سچ یہ ہے حوصلہ ہی چھوٹ گیا

آدمی خود میں کھو گیا جب سے
مشغلہ دوستی کا چھوٹ گیا

سچ کے تلوے لہولہان ہوئے
پھول کی سیج تک تو جھوٹ گیا

سب سے نظریں جھکا کے ملتا ہوں
میرا مَیں کتنا ٹوٹ پھوٹ گیا

سارے منظر لُٹے لُٹے سے ہیں
شہر کو جیسے کوئی لُوٹ گیا

۱۴؍جنوری ۱۹۸۰ء

بدلتے موسموں کی رُت ہمیں آخر کہاں لائی
نہ وہ پھولوں میں رنگینی نہ وہ کلیوں میں رعنائی

اسے توفیق کہتے ہیں جسے بخشے اُسے بخشے!
اِدھر انساں کا گونگا پن اُدھر پتھّر کی گویائی

سمندر ناپنے نکلے تھے لیکن اب یہ عالم ہے
ابھرنے ہی نہیں دیتی ہے اِک قطرے کی گہرائی

ہمارے پاس تم آؤ بھی لیکن کیسے آؤ گے
اُدھر دنیا کے ہنگامے اِدھر صحرا کی تنہائی

بڑائی ظرف پر موقوف ہے وسعت پہ مت جاؤ
سمندر میں ہے اتھلا پن تو قطرے میں ہے گہرائی

زمانے کی زبوں حالی میں دونوں ہی کا حصّہ ہے
جنوں اہلِ خرد کا اور دیوانوں کی دانائی

کم آمیزی نے شبنم کو گرایا عارضِ گل سے
سمندر کر گئی امواج کو قطروں کی یک جائی

ڈبو دیتا طبیعت کا سکوں گرداب میں لیکن
وہ اِک موجِ بلا تھی جو مجھے ساحل پہ لے آئی

نومبر ۱۹۷۸ء

دعا کرتا ہوں ربّ العالمیں دے
بس اِک دل مطمئن دے کچھ نہیں دے

ہٹا لے آسماں کو میرے سر سے
مرے پیروں تلے لیکن زمیں دے

ارادے کو عطا کر استقامت
سہارے کیلئے راسخ یقیں دے

نہ رکھ پابندِ رسمِ خانقاہی
نہ پیرِ معتکف گنبد نشیں دے

عطا کر ذہن کو فکرِ مسلسل
دلِ بیدار چشمِ نکتہ بیں دے

مجھے پاگل نہ کر دے میری حیرت
مرے مولیٰ مجھے خود پر یقیں دے

خود اپنے سائے میں چلتا رہوں میں
مجھے دیوار کا سایہ نہیں دے

کمندِ حرصِ دنیا سے بچا تو!
سمندِ عصر جب زیرِ نگیں دے

بڑی لذّت ہے تجھ سے مانگنے میں
طلب کرتا رہوں تو دے یا نہیں دے

۱۹۸۳ء

ایک چہرہ پھول سا مہتاب سا
ذہن کے گوشے میں اب ہے خواب سا

ڈگمگاتی ڈولتی کشتی سا دل
وسوسہ امکان میں گرداب سا

لاکھ انجم ہیں مگر ملتے نہیں
طاقِ منعم چرخ کی محراب سا

آج ہی تک ہے حقیقت آج کی
کل یہی لمحہ لگے گا خواب سا

تہہ نشینِ دل تمھاری یاد ہے
جھلملاتا چاند زیرِ آب سا

موت نغمے کی تھی اِک لحظہ سکوں
دل جو حرکت میں رہا مضراب سا

پردہ دارِ دوستانِ تنگ دل
تشنہ رہ کر بھی لگے سیراب سا

اگست ۱۹۸۴ء

نیکیاں رہ گئی ہیں نام طلب
عجز بھی اب ہے احترام طلب
سیریٔ دل کسی طرح نہ ہوئی
سیر دنیا کی تھی قیام طلب
دستِ مفلس سوال کو نہ اُٹھا
چشمِ منعم رہی سلام طلب
عظمتِ مردمی ہے بے طلبی
ذلّتِ مردمی کا نام طلب
دھند کی اِک دبیز چادر میں
صبحِ نو آئی بھی تو شام طلب
ذہن اُلجھے ہوئے فضا بوجھل
اب یہ محفل ہے اختتام طلب
ہم کو مطلب ہی سادگی سے رہا
اور دنیا تھی احتشام طلب
فرصتِ خاص عرصۂ ہستی
عرصۂ حشر یعنی عام طلب
دست بستہ کھڑے رہو افسرؔ
جانے کرلے وہ کب غلام طلب

۲۲ اگست ۱۹۸۴ء

وہ قد میں مجھ سے چھوٹا تھا تو کیا پہچانتا مجھ کو
اگر کچھ سر بلند ہوتا تو شائد جانتا مجھ کو

مری کرنیں کہ روشن کر گئیں تاریک گھر اس کا
مَیں اس کو جانتا ہوں جو نہیں پہچانتا مجھ کو

زمانہ چاہتا ہے کچھ تو حاصل ہو صعوبت کا
مگر صحرا یہی کہتا ہے کوئی چھانتا مجھ کو

اگر وہ مجھ سے خوش رہتا تو پھر کیوں مجھ کو خوش رکھتا
سزاوارِ عطائے غم نہ کیوں گردانتا مجھ کو

بھلے ہی سانپ آ لپٹے تھے میرے پاؤں سے افسرؔ
اگر بچ کر چلا آتا تو پھر مَیں مانتا مجھ کو

۳۱؍اگست ۱۹۸۴ء

آدمی ارتقاء کی غار میں تھا
پھر خدا تھا تو کس قطار میں تھا

عقل ہی لائی اس کی چوکھٹ تک
دل کہاں اپنے اختیار میں تھا

نیکیاں راستے میں بکھری تھیں
علم تسبیح کے حصار میں تھا

جمع تفریق کے سوالوں سے
طالبِ علم انتشار میں تھا

راستے پر تو آ چلا تھا مگر
آدمی درجۂ غبار میں تھا

طے ہوئے فاصلے قیامت کے
ورنہ اِک لمحہ کس شمار میں تھا

اس نے لایا مجھے وہاں کہ جہاں
مَیں خود اپنے ہی انتظار میں تھا

۲۶راگست ۱۹۸۴ء

فاقوں کی وبا شہر میں بڑھ جانے کا ڈر ہے
اخبار میں جو چھپ نہ سکی یہ وہ خبر ہے

جو قتل کے در پے تھا وہ کمزور نہیں تھا
مَیں آج بھی زندہ ہوں تو یہ میرا ہُنر ہے

یہ عرش کو چھوتی ہوئی دیوار یقیں کی
گر جائے گی اِک روز اگر شک کا گزر ہے

احباب کو تکلیف نہ دیجے کسی صورت
چپ چاپ ہی مرجائیے ، مرنا بھی اگر ہے

کوتاہ نہیں دِل مرا وسعت کی نہ پوچھو
دنیا مرے گھر میں ہے تو دنیا مرا گھر ہے

یہ نقشِ کفِ پا ہے کہ تہذیب کا سورج
سانسیں ہیں کہ صحراؤں میں خوشبو کا سفر ہے

ہر بات یہاں فرض ، بِلا حجّت و حیلہ
آدابِ رضا میں نہ اگر ہے نہ مگر ہے

۳۱ر اگست ۱۹۸۴ء

بس راہ نوردی کا یہاں نام سفر ہے
اِک گام پہ منزل ہے تو سو گام سفر ہے

لاحاصل و بے فیض اُڑانوں سے انھیں کیا
خوش رنگ پرندوں کا تہہ دام سفر ہے

کچھ دیر میں بھر جائے گا پیمانۂ ہستی
کچھ دور کا اے عمرِ تہی جام سفر ہے

ہم صورتِ خورشید نہیں صبح کے راہی
ہم چشمِ چراغاں کا سرِ شام سفر ہے

ہوتا جو قیام اپنا تو ہم تجھ سے سمجھتے
یہ عمر تو اے گردشِ ایام سفر ہے

ہم محویّتِ خاص میں یک لحمہ نہ چوکے
ہم سیر دماغوں کا سرِ عام سفر ہے

مَیں راہیٔ منزل ہوں گھڑی بھر نہیں رُکتا
یہ سانس جو چلتی ہے دل آرام سفر ہے

۲؍ستمبر ۱۹۸۴ء

کہیں تو فرض ہے خود کو سنبھال کر رکھنا
کہیں حرام حجابات ڈال کر رکھنا

یہ قید کسبِ ضیاء کیلئے ضروری ہے
چراغ کو نہ ہَوا میں نکال کر رکھنا

تعلّقات نبھانا ہے کارِ شیشہ گری
یہ آئینے ہیں ذرا دیکھ بھال کر رکھنا

مِری اُڑان بہت ہے نہیں تجھے آساں
مجھے بھی صیدِ ہوائے خیال کر رکھنا

مِرا یہ وصف کہ میں تیری صف میں شامل ہوں
ترا کمال مجھے باکمال کر رکھنا

جو شہسوار ہیں ان کو ہُنر یہ آتا ہے
سمندِ تیز صفت کو نڈھال کر رکھنا

نہ جستجو ہو کسی میں تو کیوں مِلو افسرؔ
غبار شیشۂ ہستی پہ ڈال کر رکھنا

۲۸ ستمبر ۱۹۸۴ء

اِدھر مَیں وقت کی رو میں رواں تھا
اُدھر انبوہِ یادِ رفتگاں تھا

جہاں تو مان لیتا وہ وہاں تھا
یقیں کی حد میں کب تیرا گماں تھا

مجھے یک سوئی کا عالم مِلا بھی
جہاں مَیں تھا وہاں سارا جہاں تھا

کھُلا کب جب کہ سورج سر پہ آیا
مکاں پر چھت نہیں تھی آسماں تھا

ابھی تو منجمد ہوں برف سا مَیں
ہَوا کے دوش پر اِک دن رواں تھا

مرے آگے رہا سورج و لیکن
مرا سایہ مرے پیچھے کہاں تھا

ہوں اب دو گز زمیں کی تہہ کے نیچے
مری مٹھی میں اِک دن آسماں تھا

نہیں تھی بھیڑیے کے سر پہ تختی
تِلک سادھو کے ماتھے کا نشاں تھا

۲۵ ستمبر ۱۹۸۴ء

باغ کا حال کیا ہُوا ہوگا ؟ پھول جب قبر پر ہنسا ہوگا

کل تھا فن پارہ عمر کا حاصل آج شو کیس میں سجا ہوگا

دیر تک میں نے کچھ نہیں سوچا دور تک وہ تو دیکھتا ہوگا

کون اُٹھائے گا دل دماغ کسے راستے میں کہیں پڑا ہوگا

مجھ کو اس حال میں جو چھوڑ گیا تو نہیں تھا تو دوسرا ہوگا

جا! مگر سوچ لے کہ آنے تک وقت چہرا بدل گیا ہوگا

گھر کا مَیں راستہ بھُلا بیٹھا وہ مری راہ دیکھتا ہوگا

وہ زبردست زیر کیا کرتا خود ہی تقسیم ہوگیا ہوگا

ہے دھمک تیز تیز قدموں کی وقت زینے اُتر رہا ہوگا

چل دیا کیوں فقیر بِن مانگے جیب سے ذہن جھانکتا ہوگا

بات آسان تھی مگر افسرؔ
سوچ میں کوئی پڑ گیا ہوگا

۱۱/۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء

نہ یوں سمجھ کوئی آیا تو اور شئے ہوگا
دِکھائی دے گا وہی ذہن میں جو طے ہوگا

دماغِ شکوہ و فریاد ہے نہ فرصت ہے
وہی نفس جو بچے گا تو صرفِ نے ہوگا

چلے ہو گھر سے تو اب واپسی نہیں ممکن
یہ وہ سفر ہے کہ طے ہو کے بھی نہ طے ہوگا

نہ خوش گماں ہوں نہ مایوس ہوں یقیں یہ ہے
کہ آدمی کے مقدر میں جو بھی ہے ہوگا

شراب علّتِ دنیا ہے شعر قدرتِ فن
تو کیوں سمجھتے ہو شاعر ہے غرقِ مئے ہوگا

ہمیں جو چاہتے تم دور گھر بناتے کیوں
یہ فاصلہ تو قیامت میں جا کے طے ہوگا

مری دوا بھی تمھیں ہو تو میرا درد بھی تم
افاقہ ہو بھی گیا ہے تو تا بہ کے ہوگا

محاذِ جنگ سے ہٹ آئے ، مَیں نہ کہتا تھا
غنیم در پئے آزار پے بہ پے ہوگا

ہمیشہ ایک سی حالت کبھی نہیں رہتی
غرورِ دولتِ دنیا خمارِ مئے ہوگا

مَیں جو بھی کہتا ہوں اپنے لئے نہیں کہتا
کہیں ہوا ہے کہ نغمہ برائے نے ہوگا

ابھی جو فاصلہ طے ہو سکے غنیمت ہے
کہاں پہنچ سکا افسرؔ وہاں یہ طے ہوگا

۱۲۰ کتوبر ۱۹۸۴ء

میں جانتا ہوں نہیں خوش مرا ہنر مجھ سے
مرا ہنر جو اُگلوائے گا گہر مجھ سے

میں شعر و فن کو لہو دوں کہ تن کو روغن دوں
سوال کرتا ہے اکثر مرا جگر مجھ سے

مرے قریب بظاہر تو وہ نہیں آتا
زیادہ رکھتا ہے لیکن مری خبر مجھ سے

سفرِ حیات کا ہے پُل صراط طے کرنا
بہت سنبھل کے مری جان تو گذر مجھ سے

مرے خلاف گواہی تلاش کرتے ہو!
نہیں ملیگا کوئی اور معتبر مجھ سے

اسے جو دیکھ لیا میں نے پھر نہ دیکھا کچھ
جواب مانگتی ہے آج تک نظر مجھ سے

میں اپنے آپ میں دریا تو کیا سمندر ہوں
یہ اور بات کہ صحرا ہے مقتدر مجھ سے

میں چاک چاک گریباں چھپا گیا کہ نہیں
رفو گری کا لیا تم نے جب ہنر مجھ سے

خدا نے خیر مرے واسطے رکھی افسرؔ
میں باخبر ہوں زمانہ ہے بے خبر مجھ سے

۱۲/اکتوبر ۱۹۸۴ء

تو نے دیکھا ہے کبھی ایسا بھی پیاسا تشنگی
تشنہ رہ کر بھی نہ جس کے منھ سے نکلا تشنگی

بند آنکھوں میں ہزاروں خواب پریاں تتلیاں
اور کھُلی آنکھوں کے آگے دھوپ، صحرا، تشنگی

سر پٹکتی موجِ دریا پیاس کی ماری ہوئی
ہم دِکھائیں گے تجھے یہ بھی تماشا تشنگی

یافت ہی سے یہ طلب کی آگ ہے بھڑکی ہوئی
کون رکھتا ہے سمندر سے زیادہ تشنگی

دیر تک دوڑا سمندر تھا مگر سِمٹا ہُوا
دور تک پھیلا ہُوا تھا ہاتھ تیرا تشنگی

اس تماشا گاہِ عالم میں بس اِک افسرؔ ہی تھا
سوکھے ہونٹوں سے جو تیرے ساتھ کھیلا تشنگی

۱۴ اکتوبر ۱۹۸۴ء

بیاضِ مصرعۂ تر دے جو لقمۂ تر بھی
رُکے نہ مشقِ سخن سے سعید افسؔر بھی

مَیں اس کی سمت رواں وہ محیط ہے مجھ پر
یہ ایک نقطہ جو مرکز ہے اور محور بھی

وہ چاند ریت کے ٹیلوں سے نور برساتا
مری نگاہ میں محفوظ ہے وہ منظر بھی

جو آنکھ پھیر لو سیلاب گھر میں دَر آئے
قدم اُٹھاؤ تو پایاب ہے سمندر بھی

مَیں تیرے پاس تو رہ کر تجھے سمجھ نہ سکا
تجھے مَیں دیکھ ہی لوں آج تجھ سے ہٹ کر بھی

شریکِ زمرۂ صاحبدلاں نہیں ہوتا
بخیل آدمی ہوجائے گر تونگر بھی

مجھے نہ لے چلو شائد وہاں مرا لہجہ
وہ آنچ دے کہ سلگ جائے وہ سمندر بھی

۱۴/۱۰/اکتوبر ۱۹۸۴ء

Scanned by CamScanner

طر سے گذرا کہاں بحرِ بے کنار ابھی
بہت زیادہ نہ کر خود پہ افتخار ابھی

ھی ابھی تو بصارت ملی ہے آنکھوں کو
کر ایک عمر بصیرت کا انتظار ابھی

لب تھی زر کی ذریعہ بنایا مکتب کو
تو علم تجھ پہ کہاں ہوگا آشکار ابھی

ی ہے لنگ قلم میں زباں میں لکنت ہے
تو اپنے آپ کو اک عمر تک سنوار ابھی

سیرِ دائرہ پابندِ قوسِ فکر و نظر
دماغ و دل پہ ہے اسباق کا حصار ابھی

ہت نصاب زدہ ہے یہ مکتبی چہرہ
اسے عمل کی کڑی دھوپ سے گزار ابھی

ماغ و فکر نئے راستے پہ چل نکلیں
فضائے ذہن کہاں ایسی سازگار ابھی

کتاب چیز الگ تجربہ الگ شئے ہے
نظر کے سامنے پھیلا ہے ریگزار ابھی

تجھے ابھی سے ہے دعویٰ حصولِ منزل کا
رہِ طلب میں بھٹکتے ہیں پختہ کار ابھی

صول ذہن میں رکھ تجزیہ نگاہ سے کر
زباں نہ کھول عجائب ہیں بے شمار ابھی

پلٹ کے مرکزی نقطے پہ تجھ کو آنا ہے
مدارِ دنیا پہ افسرؔ نہ کر مدار ابھی

۱۴ اکتوبر ۱۹۸۴ء

دن تھا ہنگاموں بھرا اور رات طوفانی بہت
اس لئے تجھ کو بھلانے میں تھی آسانی بہت

سُرخ روئی چاہتی ہے خون افشانی بہت
اور ہے اپنی طبیعت میں تن آسانی بہت

کورے کاغذ ہیں کتابوں میں نظر تشنہ مری
علم تو بڑھتا نہیں بڑھتی ہے حیرانی بہت

رنگ لفظوں کا تمھارے ذہن پر چڑھتا نہیں
فکر کر گزری ہمارے خون کو پانی بہت

اور سب امکان افسرؔ وسوسے ثابت ہوئے
زندگی میں موت ہی اِک شئے تھی امکانی بہت

۲۳ اکتوبر ۱۹۸۴ء

کہتا یہ کون غالبِ آشفتہ سر بغیر
عرضِ ہُنر میں کچھ نہیں دادِ ہُنر بغیر

زر دوست ہم نہیں ہیں مگر کیجئے بھی کیا
عزّت جہاں میں خاک برابر ہے زر بغیر

تو ہے تو زندگی کا سراپا نظر میں ہے
کچھ بھی نہیں ہے تُو مِرے حُسنِ نظر بغیر

گھر بھی ہے ریگ زار اگرچہ ہیں بام و در
صحرا بھی اک مکان ہے دیوار و در بغیر

پہلی سی بات اب نہیں اپنے مزاج میں
ورنہ دکھائی دیتا کیا افسرؔ بھی سر بغیر

۲۴ اکتوبر ۱۹۸۴ء

فاصلے سمٹے مگر دوری بڑھی
ہو گئے قادر تو مجبوری بڑھی

روشنی دیوار پر پڑتی نہیں
لَو دیے کی گرچہ ہے پوری بڑھی

شاہ کا خطبہ سرِ منبر پڑھا
اِس لئے مُلّا کی مزدوری بڑھی

لفظ پھیکے ہیں کتابوں میں یا پھر
اس طرف کچھ اور بے نوری بڑھی

شہر کی آب و ہَوا کچھ اور ہے
بیل جنگل میں نہ تھی پوری بڑھی

ربطِ باہم آج تک ٹوٹا نہیں
دور رہ کر بھی کہاں دوری بڑھی

کر گئے ہجرت پرندے اور ہم
دیکھتے ہیں اپنی معذوری بڑھی

کھُل نہ جائے آپ کے قد کا بھرم
رکھئے چادر پاؤں تک پوری بڑھی

۵ رجولائی ۱۹۸۵ء

سوچتی آنکھ بولتی صورت
چہرا چہرا ٹٹولتی صورت

برف پگھلاتی مسکراہٹ سے
بند دروازہ کھولتی صورت

تیرتے خواب سب کی آنکھوں میں
میری آنکھوں میں ڈولتی صورت

بہری آنکھوں سے اس اُجالے میں
کاش کچھ بھی نہ بولتی صورت

چبھتے تیروں سے بے خبر افسرؔ
رس فضاؤں میں گھولتی صورت

۱۰/اگست ۱۹۸۵ء

جوئے کم رو ذہنِ خفتہ کیا تر و تازہ رکھیں
بند گوش و چشم کا جب لوگ دروازہ رکھیں

ریش و جامہ کی درازی پر ہے مفتی کی نظر
اور شاہانِ سلف مُلّا بھی دو پیازہ رکھیں

بانس پر رکھ کر دِیا شہرہ کریں سورج اُگا
بند مٹھی میں کہاں تک اپنا شیرازہ رکھیں

گھر کے آنگن کے بگولے چھت اُڑا لے جائینگے
لاکھ ہم پردے گرائیں بند دروازہ رکھیں

آج جو گزری سو گزری ہوگی کل صورت نئی
آج کا اخبار کل تک کس لئے تازہ رکھیں

سامنے بونے کھڑے ہیں آپ یہ سب سے کہیں
احتیاطاً اپنے قد کا خود بھی اندازہ رکھیں

شاذؔ ہی گونجے ہے افسرؔ ایسا نغمہ ٹوٹ کر
تمکنتؔ کے قصر کا اب بند دروازہ رکھیں

(شاذ تمکنت کا یومِ وفات)

۱۸ اگست ۱۹۸۵ء

بنا کے خواب مجھے خود تو سو گیا کوئی
لہو کے کھیت ہتھیلی میں بو گیا کوئی

مَیں لمحہ لمحہ اُسے قتل کرتا آیا ہوں
یہی سبب ہے کہ سفاک ہو گیا کوئی

اب اسکے آگے جو قصہ ہے میں بھی بھول گیا
یہ بات کہہ کے کہیں دور کھو گیا کوئی

یہ بوند بوند کہاں جمع کر رہے ہو یہاں
چلو کہ دامنِ صحرا بھگو گیا کوئی

ہماری جیب میں کچھ بھی نہ تھا وہ کیا لیتا
تو نقدِ جاں کا طلبگار ہو گیا کوئی

تمام دن کی طرح شام بے مزہ نہ رہی
لہو کا رنگ شفق میں سمو گیا کوئی

کھڑے تھے ہم بھی بوقتِ سفر مگر افسرؔ
نہ جان پائے کہ کس سمت کو گیا کوئی

۲۳ / مارچ ۱۹۸۶ء

یہ اہتمامِ مکاں یوں نہ ہو مکاں یوں ہو
مفر نہیں ہے سفر سے تو خوش گماں یوں ہو

تری ہی ذات سے ممکن ہے یوں بھی اور یوں بھی
قریبِ جاں یوں رہے آنکھ سے نہاں یوں ہو

یہ آسمان کی خواہش کہ ہو زمیں ایسی
زمیں یہ چاہتی ہے اس پہ آسماں یوں ہو

ہزار رنگ ہیں دامن میں ایک تتلی کے
رہیگا کیا جو ابھی آنکھ سے نہاں یوں ہو

گمانِ حاصل و رنج و ملالِ لا حاصل
متاعِ عمر لٹے یوں یا رائیگاں یوں ہو

شمارِ زخم کی مہلت ہمیں بھی مل جائے
خدا کرے کہ خیالِ ستم گراں یوں ہو

مَیں زرد پتے اُٹھاتا پھرا ہوں پت جھڑ میں
اے شاخِ سبز تو مجھ سے نہ سرگراں یوں ہو

نہیں ہے فکر بھی شائد کہ ڈور کتنی ہے
ہَوا کے زور میں افسَر رواں دواں یوں ہو

۲۹ اپریل ۱۹۸۶ء

وہ پوچھتا نہیں ہے جیا کس قدر بتا
لمحات کا شمار نہ کر تول کر بتا

حُسنِ بیاں سے لُطف اُٹھانے کے دن گئے
قصّے کو اور طول نہ دے مختصر بتا

دریائے تند موج دِکھا اپنا زور تو
جویائے سخت کوش تو اپنا ہُنر بتا

حیلے حوالے چھوڑ کھلی صاف بات کہہ
کیونکر جلا ہے شہر میں میرا ہی گھر بتا

نوواردانِ شہر میں میرا نہ نام لے
اپنا ٹھکانہ تو ہی مجھے ڈھونڈ کر بتا

۲۶ر مئی ۱۹۸۶ء

غزل غالبؔ نہ تنہا میرؔ سے ہے
جڑی صد حلقۂ زنجیر سے ہے

مقدر ہو چکی تھی موت لیکن
یہ دل زندہ کسی تدبیر سے ہے

مَیں منظر اور نہ پس منظر کو دیکھوں
مجھے مطلب تری تصویر سے ہے

گرے ہوتے مرے آنسو تو روتا
کہ تیرا غم مری تقدیر سے ہے

مَیں بیٹھا ہوں دعا سے ہاتھ اُٹھائے
ندامت اس قدر تقصیر سے ہے

فقط دنیا اسے سمجھوں کہ مانوں
تری منشاء مری تشہیر سے ہے

مَیں خود سایہ ہوں افسرؔ اپنے قد کا
مرا قامت مری تحریر سے ہے

۱۶ / مئی ۱۹۸۶ء

معرکہ سخت جب آیا پسِ لشکر میں تھا
اور کرتا بھی تو کیا جب مری زد پر میں تھا

آئینہ ٹوٹ کے بکھرا تو بنا شہر نما
ورنہ کمرے میں مرے قد کے برابر میں تھا

کون آرام سے سویا ہے جو مرنے سے ڈرے
آگ پر تکیہ لگائے سرِ بستر میں تھا

اس کو یوں ڈھونڈھ رہا ہوں کہ پتہ خود کا نہیں
یاد اتنا ہے کہ اِک بحر کے اندر میں تھا

تیرے ہونے میں ہے اکثر کو نہ ہونے کا گماں
اور سبب اس کا جو دیکھا ہے تو یکسر "میں" تھا

اب مجھے حیرت و حسرت سے جو تکتے ہو تو کیوں؟
زیبِ سر ہونے سے پہلے بھی تو افسؔر میں تھا

۱۹ر مئی ۱۹۸۶ء

جانے کیا گوہرِ معنیٰ انھیں دے جائے غزل
آئیں جویانِ ہُنر آج بصحرائے غزل

اور پھر دیکھئے کس کس طرح تڑپائے غزل
کشتۂ خنجرِ تسلیم و نمک ہائے غزل

اِک روایت کے مطابق تو حقیقت یہ ہے
ہے کوئی اور ہی گویا پسِ لیلائے غزل

جلوۂ مہر دِکھانا بہ کفِ دستِ سخا
جزو میں کُل کو چھپانا ہے تقاضائے غزل

ایک نقطہ جو ہے موہوم پسِ پردۂ جاں
ذہن کی سطح پہ پھیلے تو اُبھر آئے غزل

پھول کاغذ پہ کئی رنگ میں بو دیتے ہیں
شرط یہ ہے کہ ہوا پائے تو کِھل جائے غزل

رنگ' ابلاغ' لب و لہجہ' علامت' ابہام
وسعتیں اور بھی مانگے ہے یہ تنگنائے غزل

میں یہ سمجھوں نہ گئی عمر اکارت افسرؔ
آپ اپنے کو اگر مجھ سے کہلوائے غزل

۲۷/مئی ۱۹۸۶ء

مسکراہٹ اس خبر سے آ گئی
باز دنیا آج شر سے آ گئی

لہلہاتی فصل تھی چاروں طرف
بھوک کی آندھی کدھر سے آ گئی

فطرتاً بھی تھا مہذّب آدمی
اور کچھ تہذیب ڈر سے آ گئی

آسماں لگتا ہے اِک نیلا دھواں
اتنی ہمّت بال و پر سے آ گئی؟

خود کو دنیا سے الگ سمجھا ہوں میں
مجھ میں دنیا کس ہنر سے آ گئی

بے سر و سامان جینے کی ادا
حسنِ شاخِ بے ثمر سے آ گئی

آج افسر حال پر اپنے ہنسی
پرسشِ اہلِ نظر سے آ گئی

۲؍جون ۱۹۸۶ء

قتل ایک قاتل ایک　　منصفی کا حاصل ایک
ملک میں ہیں ٹھگ سارے　　بادشاہ غافل ایک
اور سب ادھورے ہیں　　ہے خدا ہی کامل ایک
ہیں عمل جدا لیکن　　حکم کا تھا حاصل ایک
میرے جسم کے اندر　　روح کا ہے قاتل ایک
راستے الگ ٹھیرے　　آدمی کی منزل ایک
جاہلوں کے لشکر کو　　بس ہے مردِ عاقل ایک
اَن گنت ستارے ہیں　　اور ماہِ کامل ایک

چاہئے کہ افسرؔ ہو
آئینہ مقابل ایک

۲/جون ۱۹۸۶ء

تھے موسمی پرند جو گلشن میں آئے تھے
پت جھڑ میں چل دئے ہیں جو ساون میں آئے تھے

دیوار بے رُخی کی کھڑی کر رہے ہو کیوں؟
ہم تو فصیلیں توڑ کر آنگن میں آئے تھے

اب سرسراتے سانپ ہیں اور راستہ نہیں
صندل مہک رہا تھا جب اس بن میں آئے تھے

خوشبوئے گل سے عالمِ امکاں مہک اُٹھا
کیا جانے کس روش سے وہ گلشن میں آئے تھے

رعبِ جمال ، پاسِ ادب ، شرمِ کج روی
تجھ تک جب آئے تھے بڑی اُلجھن میں آئے تھے

دامن دراز کیسے کریں سوچتے رہے
بدنامیوں کے داغ جو دامن میں آئے تھے

زیبا ہے حُسن کو رہے بامِ بلند پر
کیا مہر و مہہ کہیں کسی آنگن میں آئے تھے

یہ شہر بے مثال تھا افسؔر شباب پر
غالبؔ سے شہر یار جب اس فن میں آئے تھے

۵ رجون ۱۹۸۶ء

مقام اپنا سمجھتے ہیں مہر و مہ مجھ سے
تو خود کو جان سکے گا قریب رہ مجھ سے

مَیں آسماں کی طرف دیکھ تو رہا ہوں مگر
چھپی نہیں ہے زمیں تیری کوئی تہہ مجھ سے

ہوائے تند میں آواز منتشر ہے تری
تو اپنی بات ذرا نیچے آ کے کہہ مجھ سے

جلوس آگے بڑھے گا تو پھر چلوں گا مَیں
اے خود پسند طبیعت تو پیچھے رہ مجھ سے

پلٹ پلٹ کے مجھے دیکھنا ہی پڑتا ہے
کہ پیچھے چھوٹ گئی ہے مری سپہ مجھ سے

اب آ گیا ہوں مَیں ایسے مقام پر کہ جہاں
چھپائے رکھتی ہے مجھ کو مری نگہہ مجھ سے

کھُلا نہیں دمِ شمشیر تھا کہ دَم میرا
بہت قریب رہی میری قتل گہہ مجھ سے

ہری تھی بیل جو بوتل میں آ کے خشک ہوئی
یہ سانحہ جو ہُوا بار بار کہہ مجھ سے

ہُوا کا زور تھما ہے تو خود ہی بیٹھ گئی
بہت زیادہ اُڑی تھی یہ گردِ رہ مجھ سے

اکیلا مَیں ہی نہیں ہوں خلوص کا مارا
بہت ہیں شہر میں افسرؔ ہدف نگہہ مجھ سے

۱۰ رجون ۱۹۸۶ء

آواز اپنی گونج میں حیران تھی بہت
کاغذ نگر میں لفظ کی پہچان تھی بہت

مَیں دیر تک اُڑا ئیں بہت دور تک اُڑا
اصلِ حیات بے سر و سامان تھی بہت

ہر حادثے کے بعد مجھے سوچنا پڑا
تھی کوئی شئے جو میری نگہبان تھی بہت

پھر یوں ہُوا کہ بڑھ گئیں دشواریاں کئی
پہلے پہل یہ زندگی آسان تھی بہت

اے طبع زخم خوردہ مزا آگیا تجھے
خوشبوئے لُطفِ یار کی مہمان تھی بہت

اب آئینے میں خود کو بھی لگتے ہیں اجنبی
وہ دن گئے کہ شہر میں پہچان تھی بہت

۲۴ رجون ۱۹۸۶ء

ضیافتِ دلِ آزردہ ایک بار کریں
چلو کہ آج کوئی قہقہہ شکار کریں

تجھی کو زیب ہے قربت کو فاصلے دینا
ہمارا کام کہ بس ہچکیاں شمار کریں

پُرانا پیڑ نئی کونپلیں اُگاتا ہے
اُسے بھی کاٹ کے کیا شہر ریگزار کریں

پھر ایک بار کٹی فصل نامرادی کی
پھر ایک سال قناعت پہ انحصار کریں

صعوبتوں سے الگ ایک اور دنیا ہے
مگر ہم اس کے لئے تم سے کیا قرار کریں

اُسے تلاش کہ آواز دے اُسے کوئی
ہمیں لحاظ کہ کیا دَم بہ دَم پکار کریں

درخت گر کے بھی سایہ بنا گیا افسرؔ
اب اطمینان سے ہم شب کا انتظار کریں

۵/نومبر ۱۹۸۷ء

زباں ہے یوں تو اِک پردار کو بھی
سلیقہ چاہیے گفتار کو بھی

غضب تھا دو گھڑی اپنا ٹھہرنا
پسینہ آ گیا دیوار کو بھی

سنیچر اس طرح پیچھے پڑا ہے
اماں ملتی نہیں اتوار کو بھی

غنیمت ہے یہ جو کچھ آگہی ہے
ترس جاؤ گے کل اظہار کو بھی

ہماری بدنصیبی کامراں تھی
رہیں مجبوریاں مختار کو بھی

اُڑا یوں جھوٹ سورج توڑ لایا
حیا آنے لگی پردار کو بھی

تمھارے تم سے چھوٹے ہوں تو شائد
سمجھ پاؤ مرے آزار کو بھی

۲۹؍جولائی ۱۹۸۶ء

مَیں نے دیکھا ہے، بہت آپ نے پرکھا ہے، بہت
پھر بھی ہر نقش زمانے کا اچھوتا ہے بہت

زندہ رہنے کیلئے سینکڑوں تدبیریں کم
اور مرنے کیلئے ایک بہانہ ہے بہت

عمر اِک لہر کی مانند گذر جاتی ہے
وقت اس لہر سے طوفان اُٹھاتا ہے بہت

یہ جو دنیا ہے مجھے لگتی ہے آنگن جیسی
میرا قد آپ کی دیوار سے اونچا ہے بہت

برف پیڑوں پہ جمی ہے تو اُگے گا سورج
تھپکیاں دے کے مجھے کوئی سُلاتا ہے بہت

تم مہذب کہ تمھیں بس نہیں شہر و گلشن
ہم وہ وحشی کہ ہمیں گوشۂ صحرا ہے بہت

دیکھنا گذرے گا اِک روز یہ آندھی بن کر
آج سبزے کی طرح خود کو بچھاتا ہے بہت

کوئی خنجر کوئی بازو مرا قاتل نہ بنا
ہاں مرے خوں نے مجھے خون رُلایا ہے بہت

کل کی تاریخ میں ہم لوگ بھی مجرم ہونگے
ہم نے چپ رہ کے یہاں خود کو بچایا ہے بہت

ہاتھ یونہی نہیں آئی یہ سعادت افسرؔ
ہے بزرگوں کی دعا جس نے نوازا ہے بہت

۲۶؍جنوری ۱۹۸۸ء

فن خوشامد کا ذرا سا بھی نہیں آتا مجھے
ورنہ یہ ہوتا سمجھتے آپ بھی اچھا مجھے

جشنِ عہدِ فصلِ گل پر ہے چراغاں ہر طرف
باغباں پھر یاد آیا باغ کا جلنا مجھے

دشت میں حاصل خیالِ صحبتِ یاراں تو تھا
شہر کی آبادیوں نے کر دیا تنہا مجھے

عطرِ گل کا خوب صورت نام پا کر قید ہوں
دور تک پھیلا گئی تھی وسعتِ صحرا مجھے

میری کوتاہی کہ اکثر بھول جاتا ہوں اسے
وہ جو تنہائی میں بھی رکھتا نہیں تنہا مجھے

تو ہی آغازِ نفس ہے اختتامِ جاں بھی تو
مَیں کہاں ہوں عرصۂ ہستی میں یہ بتلا مجھے

خاک ہوں لیکن اُڑا تو رنگِ گل اُڑ جائیگا
اے ہوائے صحنِ گلشن دیکھتے رہنا مجھے

چھاؤں پاتے ہی یوں کھوتا ہے کہ پھر ملتا نہیں
دھوپ میں آگے بڑھاتا ہے مرا سایہ مجھے

مَیں ستائش گر نہیں ہوں شاہ کا افسرؔ ہوں مَیں
میری مجبوری یہ ہے جھکنا نہیں آتا مجھے

۲۶ رجنوری ۱۹۸۸ء

کچھ نہیں لے جا رہا ہے ہاں مگر لے جائیگا
گھر کی ساری رونقیں تیرا سفر لے جائیگا

کند ہو جائیگی یہ تلوار میرے خون سے
میرا سر کٹ کر کئی صدیوں کا ڈر لے جائیگا

نیم کا اِک پیڑ باقی تھا سو وہ بھی کٹ گیا
شہر میں سر کو چھپانے اب کدھر لے جائیگا

کون آئیگا بھلا انجام میرا دیکھنے
زرد پتّا جب وہاں میری خبر لے جائیگا

مَیں تماشا بن کے کیوں پھرتا اگر یہ جانتا
آپ کو ذوقِ تماشا بام پر لے جائیگا

۶ مئی ۱۹۸۸ء

ہم ہیں واقف گردشِ ایام سے
اس لئے ڈرتے نہیں آلام سے

روشنی اُلجھی رہی ظلمت سے تم
رات بھر سوتے رہے آرام سے

ننھے پودوں کے بھی قد بڑھنے لگے
روشنی گھٹنے لگی ہے شام سے

کچھ بھی کہئے اپنی کُٹیا خوب ہے
محل تو بچتے نہیں نیلام سے

ڈھونڈنے نکلو اگر اپنا پتا
کام رکھنا صرف اپنے کام سے

بس نہ تھا افسرؔ جنھیں سارا جہاں
آج اِک گوشے میں ہیں آرام سے

۱۰ر جون ۱۹۸۸ء

گلے ملیں تو بنا رہتا ہے گماں دیوار
یہ اور بات کہ ہوتی نہیں عیاں دیوار

طواف کرتے ہو اپنا تمھیں نہیں معلوم
میانِ مرحلۂ آگہی ہے جاں دیوار

رواں دواں جو اُٹھے ہم کشاں کشاں لوٹے
زمیں تھی ایک رُکاوٹ تو آسماں دیوار

ہے سوچ سایہ خیال و نظر پہ چھایا ہُوا
ہیں ریزہ ریزہ فصیلیں دھواں دھواں دیوار

بڑھوں تو کیسے بڑھوں کس کے در پہ دستک دوں
قدم قدم پہ احاطے جہاں تہاں دیوار

چھپائے رکھتے ہیں بے چہرگی کسی صورت
اُٹھاتے پھرتے ہیں ذہنوں کے درمیاں دیوار

۲۲رنومبر ۱۹۸۸ء

دور تک پھیلی ہے اِک لاچارگی
اب کہاں جائیں گے ہم آوارگی

ذہن کے پردے پہ کچھ رہتا نہیں
راس آجاتی ہے جب نظّارگی

مول کیا کرتے کسی دوکان پر
جھانکتی تھی جیب سے بے چارگی

آپ بیتی تین لفظوں میں ہے یوں
مفلسی ، فرزانگی ، آوارگی

کچھ نہیں نظارہ اپنے آپ میں
آنکھ پر ہے منحصر نظّارگی

موت تو ملتی رہی اکثر گلے
زندگی روٹھی مگر یکبارگی

۲۴ر نومبر ۱۹۸۶ء

لحظہ لحظہ ڈوبتے سورج کا منظر اور مَیں
قطرہ قطرہ ختم ہوتا اِک سمندر اور مَیں

بے نیازِ رنگ و روغن کوئے شہرت سے پرے
شہر میں یکتا ہیں دونوں اِک مرا گھر اور مَیں

بھاگتے سایوں کے پیچھے چیختے قدموں کا شور
روز اُٹھتا روز تھمتا ایک محشر اور مَیں

آج اِس مُٹھی میں مٹّی ہے تو سونا کیا ہُوا
سوچتے بیٹھے رہے میرا مقدر اور مَیں

اس تصور ہی سے میرے پاؤں پتھرانے لگے
کیسے دیکھوں اپنے ماضی کو پلٹ کر اور مَیں

پور پر اُنگلی کے ہے سارا حسابِ دشمناں
دوستوں کے واسطے رکھتا ہوں دفتر اور مَیں

تم مرا لہجہ نہ دیکھو میری باتوں کو سنو
چل دیا تو پھر نہ آؤں گا پلٹ کر اور مَیں

۲؍جون ۱۹۸۸ء

یہ اندھیرا الاماں کچھ روشنی
خالقِ کون و مکاں کچھ روشنی

ساری دنیا کا ہُوا ہے فائدہ
اور سورج کا زیاں کچھ روشنی

رات اس پرچھائیوں کے شہر میں
کر گئی اپنی اذاں کچھ روشنی

قریہ قریہ نور برساتے پھرے
گھر میں کر جاتے میاں کچھ روشنی

جان پروانے نے دی بے فائدہ
شمع کیا تھی، کچھ دھواں کچھ روشنی

دور تک یہ وادیٔ ظلمات ہے
اے امیرِ کارواں کچھ روشنی

ڈوبتے سورج نے افسر کیا دیا
کچھ اندھیرے کا گماں کچھ روشنی

۲۵/جولائی ۱۹۹۰ء

جز فریبِ آگہی کوہِ ندا میں کچھ نہ تھا
اِک ہوائے سیرِ گلشن تھی ہَوا میں کچھ نہ تھا

مَیں ہی مصروفِ وغا تھا مَیں ہی مصروفِ دعا
یعنی بس تنہا وغا میں یا دعا میں کچھ نہ تھا

سر بریدہ تن پڑے ہیں خامشی کے دشت میں
کاٹ تھی شمشیر میں صوت و صدا میں کچھ نہ تھا

کچھ ٹھکانہ ہی نہیں ہونے نہ ہونے کا یہاں
اِک ذرا میں ہو گیا سب اِک ذرا میں کچھ نہ تھا

شورِ قاتل زورِ قاتل میری کمزوری سے تھا
مَیں جو برسا ہوں تو پھر آتشکدہ میں کچھ نہ تھا

۲۴ر نومبر ۱۹۸۹ء

دیکھئے یہ بھی چہرہ دستی ایک
نام چالیس گاؤں بستی ایک

آدمی بے نیاز رہتا ہے
سو شہنشاہی فاقہ مستی ایک

اور سارے ہی فن ہوئے مہنگے
رہ گئی شاعری ہی سستی ایک

مجھ سے دو چار ہی نہیں ہوتی
گھر میں رہتی تو ہے گرہستی ایک

بوجھ ہم ہی نہیں بنے افسرؔ
بوجھ تھی ہم پہ اپنی ہستی ایک

سازِ دل ہے جام ہے کچھ تو کہو
گنگناتی شام ہے کچھ تو کہو

یوں نہ بیٹھو چُپ خدا کے واسطے
زندگی انعام ہے کچھ تو کہو

اے پرندو! بند پنجرے میں تمھیں
کس قدر آرام ہے کچھ تو کہو

حالِ دل کہنے کو ہم کہتے نہیں
ہاں مگر کیا نام ہے کچھ تو کہو

اجنبی ہیں ہم تمھارے شہر میں
یہ تمھارا کام ہے کچھ تو کہو

لو بڑھاتی تان میں چھیڑو غزل
ڈھلنے والی شام ہے کچھ تو کہو

۴؍جولائی ۱۹۸۶ء

ہم نے جب دی تھی جوانی رات کو
تم کہاں تھے ؟ اس سُہانی رات کو

صبح جب بچّے اُٹھے گُم سم سے تھے
سُن کے سوئے تھے کہانی رات کو

صحن میں میّت رکھی اور سو گئے
کون سُنتا نوحہ خوانی رات کو

فاقہ مستوں کے ہرے ہوتے نصیب
اوڑھنی ملتی جو دھانی رات کو

ساری بستی بہہ گئی سیلاب میں
مانگ کر سوئے تھے پانی رات کو

یکم فروری ۱۹۹۱ء

(امریکی قزاقی اور عراقی تباہی کی داستاں)

شاخِ شجر پہ ایک بھی پتّہ ہرا نہ تھا
پھر بھی لہو پلانے کا جذبہ مرا نہ تھا

شیخِ حرم فروش تو لرزاں تھا اور وہ
تنہا تھا بُت بھی توڑے تھے لیکن ڈرا نہ تھا

سائے گھروں میں آگئے دیوار پھاند کر
اس شہرِ نور میں تو یہ امکاں ذرا نہ تھا

عالم پناہ جائے پناہ ڈھونڈتے پھرے
شہرِ سپاہ میں کوئی خواجہ سرا نہ تھا

مظلوم کو نہتا بنانے میں تھے شریک
ظالم کو روکتا کوئی ایسا کھرا نہ تھا

یلغار ہر چہار طرف سے تھی پھر بھی وہ
حیرت زدہ ضرور تھا لیکن ڈرا نہ تھا

سب اپنی جاں سمیٹ کے خاموش ہو گئے
قزاقیت کے نام پہ دھبّہ ذرا نہ تھا

ہر لمحہ تازہ قبر ابھرتی تھی شہر میں
لیکن لہو پلانے کا جذبہ مرا نہ تھا

سودا تھا اس کے سر میں وہ بولی لگا گیا
ہر چند اس کی جیب میں سکّہ کھرا نہ تھا

شاہوں سے بڑھ کے جرأتِ کردار کا امیر
سولی پہ چڑھتے وقت ذرا بھی ڈرا نہ تھا

کس بے حسی کے دور میں افسر تھے آپ لوگ
انسانیت کا قتل ہوا دُکھ ذرا نہ تھا

(۱۱ر فروری ۱۹۹۱ء)

ریت تھی مٹھی میں جیسے اس طرح ہر پل اُڑا
آج کی صورت میں جو کچھ بھی مِلا وہ کل اُڑا

مَیں اُسی محرومیت کے ساتھ دیکھوں گا تجھے
تو اُسی انداز سے کھڑکی میں آ' آنچل اُڑا

پھول سے چہرے تو مرجھا ہی دیئے تھے اے ہَوا
ننھی آنکھوں سے بھی آخر لے گئی کاجل اُڑا

نقش ہو کر رہ گئی ہے اِک کبوتر کی اُڑان
اتنی صدیاں بیت جانے پر نہ وہ اِک پَل اُڑا

شبنمی ٹھنڈی پھواروں کو ترستے رہ گئے
پھر وہ پُروائی چلی ہے اور نہ وہ بادل اُڑا

چلیئے افسؔر ہوگیا اِک بھیگی رُت کا خاتمہ
آخری جو اِک پرندہ بچ رہا تھا کل اُڑا

۱۹ر فروری ۱۹۹۱ء

زہر پھیلا ہے اُترنا چاہیے
آستیں کا سانپ مرنا چاہیے

چاہیے شیشہ مقابل ہر گھڑی
حسن کو ہر دَم سنورنا چاہیے

غیر کو اپنا بنانے کیلئے
خود کو پہلے غیر کرنا چاہیے

چھت کا سایہ بھی ضروری ہے مگر
سر سے سورج بھی گذرنا چاہیے

ہر کنواں گہرائی رکھتا ہے میاں
آپ اپنے قد سے ڈرنا چاہیے

ہے بہت بے ساختہ پن کی کمی
اِن پہاڑوں کو تو جھرنا چاہیے

چاہیے بکھراؤ بھی ترتیب سے
خوب کو خوبی سے مرنا چاہیے

پھر وہ چڑیا اور دانے کی تلاش
ختم اِس قصّے کو کرنا چاہیے

اس فصیلِ خامشی سے اس طرف
تان کی لَے پر اُترنا چاہیے

۴؍مارچ ۱۹۹۱ء

جب سے دنیا دیکھی تب سے دھڑکا دل کے اندر ہے
دنیا دل کے باہر ہے یا دنیا دل کے اندر ہے

بگلے نے پر اوڑھ لیے اور تم نے بھگت بھی مان لیا؟
یہ تو آگے بھید کھلے گا کیا کیا دل کے اندر ہے

سایہ صورت جسم پھرے ہیں پیکر دھند کے جیسے ہیں
کیسے ہو پہچان کسی کی چہرہ دل کے اندر ہے

قید مکاں کی ہے نہ زماں کی جذبوں کی دنیا ہے الگ
پیڑ ہزاروں کوس کھڑا ہے سایہ دل کے اندر ہے

اپنے آپ میں کچھ بھی نہیں، ذرّہ بھی نہیں سورج بھی نہیں
ویسا ہی پاؤ گے مجھے تم جیسا دل کے اندر ہے

جیسے تیسے عمر گزاری خواب کہاں کے خواہش کیا؟
جاتے جاتے دیکھنے بیٹھے کیا کیا دل کے اندر ہے

۱۶/مارچ ۱۹۹۱ء

بلائے غم سے بھی ہم نے مزے خوشی کے لئے
کہ ہم بنے ہی نہ تھے دل شکستگی کے لئے

تمھارے پاؤں میں پازیب تھی کہ زنجیریں
جو اِک قدم بھی نہ بڑھ پائے تم کسی کے لئے

توقعات پہ قائم ہے دوستی کا بھرم
نہ آزماؤ تو اچھا ہے دوستی کے لئے

ملی نہیں یہاں سورج کو بھی ہمہ گیری
کبھی کسی کے لئے ہے کبھی کسی کے لئے

یونہی جیئو کہ یہ جینا ہے کون موت سے کم
فرازِ کوہ پہ کیوں جاؤ خودکشی کے لئے

۱۷ر مارچ سنہ ۱۹۹۰ء

تازہ دم، پُر عزم، شعلہ بار دن — شام کو ثابت ہُوا بے کار دن
آنکھ کھُلنے کو ہوئے ہیں چار دن — ہیں بصیرت کو ابھی درکار دن
زرد کرنیں، سرد جھونکے، گرد ہم — کس طرح کاٹیں یہ شب آثار دن
صبح کو رہتے ہیں ہم فالج زدہ — رات کو ملتا نہیں عیّار دن
بھوک لے کر خوان میں آئی ہے شام — آئے گا کل تشنگی بردار دن
عمر یعنی لاش کا لمبا سفر — زندگی کی عمر بس دو چار دن
رات ہی کو چل دیا وہ قافلہ — اب کریدے راکھ کا انبار دن
کس بناء پر کوئی سمجھوتہ کریں — تم نمودِ شب مرا اظہار دن
جی حضوری میں اُگا دیں آفتاب — رات کو کہہ دیں اگر سرکار دن
آپ بیتی کیا لکھوں کیونکر لکھوں — ہیں کہاں کچھ قابلِ اظہار دن
رات بس اس بات پر برسی بہت — لکھے کیوں آتا ہے یہ اخبار دن

رات بھر جاگا کئے افسرؔ کہ ہم
کل کہاں کاٹیں گے اِک بیکار دن

یکم/اکتوبر ۱۹۹۱ء

روشنی درکار تھی سارے مکانوں کے لئے
اور وہ مینار پر تھی آسمانوں کے لئے

دل مرا ڈوبا نہیں سورج اگر ڈوبا تو کیا
مَیں کہ اِک روشن دیا ہوں خستہ جانوں کے لئے

تم تقابل ڈھونڈتے ہو اس کے اپنے درمیاں
وہ جو تھا' ہے اور رہیگا کل زمانوں کے لئے

تم تو ہلکی چوٹ میں جامے سے باہر ہو گئے
آستیں رکھتے ہیں ہم آتش فشانوں کے لئے

نفسی نفسی اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ اب
اپنا سر بھی بوجھ ہے خود اپنے شانوں کے لئے

یاد رکھو پاؤں کے نیچے زمیں بھی چاہیے
کیوں پھدکتے ہو بہت اونچی اُڑانوں کے لئے

میرا ہی سینہ ہُوا چھلنی چلو اچھا ہُوا
تیر مَیں نے ہی بنائے تھے کمانوں کے لئے

سر نہیں کٹتے مگر رگ رگ تو کٹتی جائے ہے
دشمنی تلوار ہے دو خاندانوں کے لئے

۲/اپریل ۱۹۹۱ء

مقدّرات کے ہاتھوں میں جو کھلونا ہے
اُسے یہ زعم جو ہوگا اسی سے ہونا ہے

جہاں میں حاصل و لا حاصلی کا رونا ہے
جسے نہیں ہے بچھونا اُسی کو سونا ہے

ترا سفر بھی ہے اپنی خلاؤں کی جانب
مجھے بھی اپنی ہی مٹّی میں جذب ہونا ہے

نہیں ہے آبرو گوہر کی قدر و قیمت پر
صدف میں بند نہ ہونا ہی آب کھونا ہے

کسی کا ساتھ کوئی عمر بھر نہیں دیتا
یہ حادثہ تو کسی موڑ پر بھی ہونا ہے

ابھی سے ہاتھ چھُڑانے پہ ہے مصر یہ ہَوا
ابھی تو شام کا موسم بڑا سلونا ہے

یہ لحہ لحہ اذیّت یہ آن آن عذاب
بس ایک بار ہی ہوجائے جو بھی ہونا ہے

اُسے بھی گریۂ پیہم عزیز ہے افسؔر
ہمیں بھی خانۂ ویراں کو روز دھونا ہے

۲/اپریل ۱۹۹۱ء

رنجشوں کی آنچ رکھ افکار تک
تا کہ گل جیسی رہے گفتار تک

عمر بھر چلتے رہے اربابِ زر
اور بس دیوار سے دیوار تک

آدمی صدیوں میں پاتا ہے نمو
اور مہک اُٹھتے ہیں پھر ادوار تک

بے نیاز و بے طلب بے لوث رہ
دوستی محدود رکھ ایثار تک

ہر خبر لگتی ہے جرثومہ زدہ
اس وبا میں مت پڑھو اخبار تک

محنتیں ہیں سلسلہ در سلسلہ
اس گلی سے چین کی دیوار تک

دو گھڑی کو ہم بھی آنکھیں موند لیں
سو گئی جب رونقِ بازار تک

اک نظر میں لہلہا جاتا ہے دل
اپنی جنّت سبزۂ دیوار تک

عبدیت کو سر بلندی کر عطا
مسجدیں اونچی ہیں بس مینار تک

اے ستارو! کس لئے ڈرتے ہو تم
ہم رہیں گے صبح کے آثار تک

۲۳/اپریل ۱۹۹۱ء

تُو میری ہر خبر مفقود رکھنا
مجھے اپنی ہی تک محدود رکھنا
تمیزِ حق و باطل کے لئے ہے
دِیے کی لَو میں شامل دود رکھنا
مری عادت بنا دے شکر کرنا
شکایت سے پرے معبود رکھنا
جھکا دے آسماں جیسا زمیں پر
مگر پھر خواہشیں محدود رکھنا
تجھے آباد بھی کرنی تھی دنیا
مجھے بھی تھا ترا مقصود رکھنا
سکھا دے تہہ بہ تہہ صحرا بنا دے
مگر جوشِ نمو موجود رکھنا
جو سر دینا دماغِ بندگی بھی
مرے مولیٰ مرے معبود رکھنا
سمجھتے ہیں یہ سودا ہے زیاں کا
تو پھر کیوں آرزو بے سود رکھنا
نہ کچھ رکھنا ہمارے جھونپڑوں میں
اگر رکھنا تو بس بارود رکھنا

اسی کی ذات سے افسرؔ ہے ممکن
یہ نظمِ بزمِ ہست و بود رکھنا

یکم مئی ۱۹۹۱ء

تیر جب بھی کمان میں رکھنا — خود نشانہ ہو دھیان میں رکھنا
جب بھی دیوار اُٹھے پڑوسی کی — رخنہ اِک درمیان میں رکھنا
ہے نصیحت تو تلخ ہی ہوگی — تم ہی مصری زبان میں رکھنا
فی زمانہ بہت ضروری ہے — اِک دُکاں بھی مکان میں رکھنا
لیکے تلوار شہر میں نکلو — دھار لیکن میان میں رکھنا
دفن کر دینا جرم زیرِ زمیں — نیکیاں آسمان میں رکھنا
عقل ہی سے دکان چلتی ہے — صرف ایماں قرآن میں رکھنا
پچھلے سارے سبق بھُلا دینا — اور دلیل امتحان میں رکھنا
پیڑ آواز دیں اُترنا مت — ان پَروں کو اُڑان میں رکھنا
دشمنوں سے مِلو مگر اُن کی — بدگمانی گمان میں رکھنا
ساری باتیں یہ رکھ رکھاؤ کی ہیں — اتنی صدیوں کو آن میں رکھنا
تھا ضروری بشہرِ تنگ دِلاں — اپنے قامت کو دھیان میں رکھنا

یکم مئی ۱۹۹۱ء

آسماں اوندھا پیالہ اور زمیں دستِ فقیر
کیوں ہتھیلی پر نہیں ہے سکۂ ماہِ مُنیر

خواہشیں بڑھتا سمندر آرزو اُٹھتا پہاڑ
زندگی گُھلتا نمک ہے آدمی مِٹتی لکیر

کچھ گھروندوں کے لئے زد پر ہے پوری کائنات
ذہن ہے محبوسِ زنداں مسئلہ آفاق گیر

قربتوں میں بُعد ہے دوری میں ہیں نزدیکیاں
آدمی کے ذہن کی ملتی نہیں کوئی نظیر

رات دن تیشہ زنی کی اور آخر لائے کیا ؟
سوندھی مٹّی کے نمک کو کھانے والی جوئے شیر

بجھ گیا شبنم سے افسرؔ ذہن کا جلتا اَلاؤ
دب گیا انبارِ زر میں بولنے والا ضمیر

۳۰/جولائی ۱۹۹۱ء

وہی ہم ہیں وہی لاچاریاں ہیں
وہی یاروں کی دنیا داریاں ہیں
وہ سوکھی آنکھ سے رونا بلکنا
عزاداری میں بھی فنکاریاں ہیں
کہاں تک تم علاج اس کا کروگے
کہ اس دِل کو کئی بیماریاں ہیں
نصیب اپنا لکھا ہے آسماں پر
زمیں پر صرف ذمّہ داریاں ہیں
جھلس جائے گی انگلی، مت کریدو
ابھی تک راکھ میں چنگاریاں ہیں
صبا سرگوشیوں میں کہہ رہی ہے
یہاں سے کوچ کی تیاریاں ہیں
نہیں کچھ فرق گُل رُت ہو یا پت جھڑ
طبیعت کی جدا گلکاریاں ہیں
جگر پتھر کا رکھتا ہے سخنور
چٹانوں سی یہاں تہہ داریاں ہیں
متاعِ غم چھپائیں کیوں نہ افسرؔ
شریفوں کی یہی زرداریاں ہیں

۲۶رفروری ۱۹۹۲ء

آج کے لمحات کی قیمت سمجھ پائے گا کون ؟
کل کے کھنڈر سے دفینے ڈھونڈھ کر لائے گا کون؟

مجھ سے جو پہلے اُٹھے ہیں مَیں بھی اُن جیسا نہیں
مَیں جو اُٹھ جاؤں تو مجھ سا دوسرا آئے گا کون

شہر کو ٹھنڈی ہَوا نے برف کر کے رکھ دیا
صبح تک سورج اُگے گا شب کو گرمائے گا کون

شہرِ باطل میں ہوں مَیں اِک منبرِ حق کی مثال
مَیں بھی گر جاؤں تو پھر حق کی طرف لائے گا کون

مَیں ہی بستی میں ہوں افسرؔ آخری گھر کا دِیا
مَیں بجھا تو دور سے پھر راہ دِکھلائے گا کون

۳ مارچ ۱۹۹۳ء

"محبی نثار کے انتقال کی خبر سن کر"

ساتھ تجھ کو قضا کے جانا تھا
یار تھا مِل مِلا کے جانا تھا

صاف کرنا تھا گرد چہرے کی
سر پہ چاندی سجا کے جانا تھا

دل لرز جائیں گے اندھیرے میں
کوئی سورج اُگا کے جانا تھا

بیل بڑھ آئی گھر کے آنگن میں
اس کو مونڈھے چڑھا کے جانا تھا

چل دیا یوں کہ کچھ خبر نہ ہوئی
کچھ تو ہم سے بتا کے جانا تھا

اے چراغِ نفس بقولِ انیسؔ
سامنے کیوں ہوا کے جانا تھا

۶ر جون ۱۹۹۲ء

بہت ناگفتہ ہے حالِ دروں بھی
کوئی پُرساں ملے تو کچھ کہوں بھی

بہت ہے لافِ عقل و شورِ دانش
نہیں ہے بے نمک اپنا جنوں بھی

دفینے ہیں تو دیواروں کے نیچے
گِراؤں ان کو تو خود سے گِروں بھی

تقاضا یہ کہ دنیا سے نہ اُلجھوں
تماشا یہ کہ دنیا میں رَہوں بھی

مگر باقی رہیں گی داستانیں
گذر جاؤ گے تم بھی موجِ خوں بھی

۲۱/اگست ۱۹۹۲ء

ہمّت و حیرت کا منظر دیکھنا
ایک سیپی کا سمندر دیکھنا

بھول بیٹھے کار گاہوں کی طرف
سجدہ گاہوں سے نکل کر دیکھنا

شہر ہی جب شَر سے ہے لپٹا ہُوا
کس محلّے میں بھلا گھر دیکھنا

چُھٹ گیا بچپن مگر چھوٹا نہیں
ریل کی کھڑکی سے منظر دیکھنا

سخت مشکل ہے کہ مشکل ہی نہیں
خود ہی اپنا گھر جلا کر دیکھنا

چھت سلامت کیا رہی برسات میں
پڑ گیا دیوار میں در دیکھنا

آگ کی لپٹوں میں ہیں لپٹے ہوئے
اور کیا باقی ہے افسر دیکھنا

۲۴/اگست ۱۹۹۲ء

کہو گے کس سے کہ ڈر کیوں جمائے رکھتی ہے
یہ رات جسم نہیں صرف سائے رکھتی ہے

ہزار پاؤں کی وہ اِک عجیب شئے ہر دَم
مِرے دماغ میں پنجے گڑائے رکھتی ہے

کسے اماں ہے طلب خیز اشتہاروں سے
ہے ایک عقل جو دل کو بچائے رکھتی ہے

ہم اہلِ دل کو سمجھتی ہی کیا ہے وہ ہستی
جو سنگ سینے میں دل کی بجائے رکھتی ہے

نظر تو آتی ہے وہ چیل آسمانوں میں
مگر زمین پہ نظریں جمائے رکھتی ہے

مِرے وجود میں ضم ہے کسی چراغ کی لَو
اندھیرے گھر میں جو مجھ کو جلائے رکھتی ہے

نہیں ہے دولتِ قاروں سے کم مجھے افسؔر
مِری خودی جو مِرا سر اُٹھائے رکھتی ہے

۵ نومبر ۱۹۹۲ء

جو گھونسلے ہی میں دانہ اُتار سکتا ہے
اُڑا اُڑا کے وہ بھوکا بھی مار سکتا ہے

ہے فیل تن کو سنبھالے یہ سانس کی ڈوری
نفس نہ ہو تو کوئی دَم بھی مار سکتا ہے

اے برگِ زرد مجھے اپنی کپکپاہٹ دے
یہ خوف ہی مری دنیا سنوار سکتا ہے

غرورِ بے جا کو جا دے رہے ہو یاد رہے
یہ تاجِ سر ہی نہیں سر اُتار سکتا ہے

زمینِ دشتِ بلا ہو یا تہہ سمندر کی
کہیں بھی جوشِ نمو سر اُبھار سکتا ہے

تمام رات کا ہارا ہُوا جواری تو
لگے جو داؤ تو سورج بھی ہار سکتا ہے

مری بساط بس اِک ثانیہ سہی مگر افسرؔ
زمانہ کیا مجھے پھر سے گذار سکتا ہے ؟

۵ر نومبر ۱۹۹۲ء

۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کے یومِ سیاہ کے نام
یہ غزل ۱۸/جون ۱۹۸۷ء کو کہی گئی تھی، ۱۰/دسمبر ۱۹۹۲ء کو یہ ناتمام غزل مکمل ہوئی۔

میری پیشانی پہ تازہ اور گہرا زخم تھا
آخری دہلیز تھی وہ شہر آگے ختم تھا

اب تو اس جنگل میں پاگل آندھیوں کا زور ہے
اس جگہ سُنتے ہیں آب و باد کا بھی نظم تھا

دھوپ ایسی تھی کہ سایہ جسم سے پہلے جَلا
اِک خیابانِ تخیّل پھر بھی زیرِ چشم تھا

خاک میں خوں مِل گیا تب یہ حقیقت وَا ہوئی
مَیں درندوں کو سدھا سکتا ہوں میرا وہم تھا

رات کی تاریکیوں میں ہوگیا نیزہ بکف
دن میں تو جو بھی مِلا پابندِ راہ و رسم تھا

شہر کی اونچی عمارت ڈھے گئی سیلاب میں
پیڑ تو باقی ہے جس میں پربتوں کا عزم تھا

۱۰/دسمبر ۱۹۹۲ء

یوں نہ سمجھو بڑھ کے اِک عالم ہوا جاتا ہوں مَیں
دن بہ دن لحظہ بہ لحظہ کم ہُوا جاتا ہوں میں

صبح کی پہلی کرن لیکر مجھے تم ڈھونڈنا
رات کی تاریکیوں میں ضم ہُوا جاتا ہوں مَیں

پیشِ مردانِ تکبّر اِک سمندر ہوں مگر
عاجزوں کے سامنے شبنم ہُوا جاتا ہوں مَیں

چیختے طوفان اب میرا تعاقب ہے فضول
اِک سریلی تان میں مدغم ہُوا جاتا ہوں مَیں

پردہ پوشی کو ضروری جانتا ہوں اس لئے
روشنی رکھتے ہوئے مدھم ہُوا جاتا ہوں مَیں

تم سے کیا کہنا تمھارا کام تھا تم نے کِیا
آپ اپنی ذات پر برہم ہُوا جاتا ہوں مَیں

۱۵/اپریل ۱۹۹۳ء

ہے آگے ایک بیابان اس ببول کے بعد
ہمارا کوئی نہیں ہے دلِ ملول کے بعد

نہ جانے خود کو کہاں چھوڑ آیا رستے میں
مجھے تلاش ہے اپنی ترے حصول کے بعد

سفر حیات کا کب ختم ہونے والا ہے
کہ جب زمیں نہ ہوئی ختم عرض وطول کے بعد

تمھاری ذات ہی کیا قوس میں گھرے ہندسو!
نہ کچھ اصول سے پہلے نہ کچھ اصول کے بعد

فراق و وصل ، عذاب و ثواب ، باطل و حق
نزول سب کا ہُوا ہے مِرے نزول کے بعد

نمک کی طرح گھُلا یوں کہ کچھ بچا ہی نہیں
پسِ سوالِ طلب کاوشِ فضول کے بعد

۱۷/۱/اپریل ۱۹۹۳ء

آرزو ملنے کی ہوگی اور نہ ملنے پائینگے
اپنی اپنی دھجیاں سینے میں دن کٹ جائینگے

آج یوں بیٹھے ہیں گویا بیٹھنا ہے بس یونہی
اور جب اُٹھنے پہ آئینگے تو یوں اُٹھ جائینگے

آج مِل بیٹھے ہیں کچھ فرصت بھی ہے اور دل بھی ہے
داستانِ زندگی اِک بار پھر دہرائینگے

آج ناقدری میں جینا کل جلا دے گا ہمیں
جب کرن بن کر کسی کے ذہن میں لہرائینگے

چاندنی راتوں کی ٹھنڈک اب کہاں سے لائیں ہم
چشمِ اشک آلود تجھ کو دھوپ میں پتھرائینگے

۱۸/اپریل ۱۹۹۳ء

مَیں کہاں موج اُڑانے کیلئے زندہ ہوں
موت کے ایک بہانے کیلئے زندہ ہوں

پیڑ آنگن میں لگانے کیلئے زندہ ہوں
آج ہوں کل کے زمانے کیلئے زندہ ہوں

تم نہ پاؤگی مجھے صبح کی کرنو ! مَیں تو
رات کو راہ دِکھانے کیلئے زندہ ہوں

نہ کوئی آس نہ اُمید نہ ارمان نہ خواب
مَیں تو بس سانس کے جانے کیلئے زندہ ہوں

اب وہاں پر نہ مجھے آگ دِکھانا یارب
مَیں یہاں آگ بجھانے کیلئے زندہ ہوں

اپنے تلوؤں میں کھٹکتے ہوئے کانٹے لے کر
راہ میں پھول بچھانے کیلئے زندہ ہوں

سانس کی آمد و شد روک رکھے ہے ورنہ
مَیں کہاں کوئی خزانے کیلئے زندہ ہوں

مجھ پہ اس دنیا میں رہنے کی ہے تہمت افسرؔ
جب سے آیا ہوں تو جانے کیلئے زندہ ہوں

۲۶/اپریل ۱۹۹۳ء

ٹھوکریں کھاتے رہے نذر بہ طوفان ہوئے
زندگی ہم پہ ترے سینکڑوں احسان ہوئے

تو نہ ہو پائی کبھی سہل ہماری خاطر
زندگی ہم ہی ترے واسطے آسان ہوئے

گھر کا گھر بہہ گیا سیلاب میں کچھ علم نہیں
مَیں تو اس سوچ میں ہوں کیا مرے اوسان ہوئے

مدتوں بعد کہیں آئینہ دیکھا ہم نے
اور پھر اپنی طرف دیکھ کے حیران ہوئے

درد بھی لذّتِ جاں رکھتا ہے معلوم نہیں ؟
تم مرے واسطے بے وجہ پریشان ہوئے

زندگی اپنے طریقے سے گذاری ہم نے
نہ کبھی ہار ہی مانی نہ پریشان ہوئے

۲۷/اپریل ۱۹۹۳ء

فکر کو بلندی سے دو گے تم اگر آواز
کھٹکھٹا نہ پائے گی ذہن و دل کے در آواز

لاکھ زخم خوردہ ہوں لاکھ طوق پہنے ہوں
کچھ نہ کچھ تو رکھتی ہے آپ میں اثر آواز

سونپ کر متاعِ جاں دل میں دل نہیں رہتا
کھو نہ جائے چیخوں میں دل کی معتبر آواز

شہرِ نا سماعت میں اپنی قدر کھوئیں کیوں ؟
ہم سمیٹ رکھتے ہیں اپنی منتشر آواز

ہم نکل نہیں پاتے وحشتوں کے جنگل سے
بستیوں سے آتی ہے روز ہی دگر آواز

جو نہیں سمجھتے ہیں بس وہ شور کرتے ہیں
جو شعور رکھتے ہیں وہ ہیں گوش بر آواز

کیا صدا لگائی تھی یہ بھی ہم بھلا بیٹھے
مدّتوں میں آئی ہے آج لوٹ کر آواز

زخم ناشناسی کے میری جان کیوں لیتے
تم بھی کچھ نہیں دیتے کچھ نہیں، مگر آواز !

۲۱ رمئی ۱۹۹۳ء

ہزار لفظوں کے دریا کھنگال کر لانا
نہیں ہے سہل یہ گوہر نکال کر لانا

مَیں کیا اُٹھاتا سڑک پر گرے ہوئے سِکّے
کہا تھا گھر نے کہ پگڑی سنبھال کر لانا

مرا ہی سایہ مری دسترس سے باہر تھا
مرے ہی سر پہ تھا سورج نکال کر لانا

مرے وجود میں موجود ہے عدم میرا
ہَوا کے رُخ پہ مجھے تم سنبھال کر لانا

عجیب بات کہ سیپی سے کھیلتا ہوں مَیں
مجھے تو آتا ہے موتی نکال کر لانا

ذرا سی بات کی اور اس نے ٹھگ لیا سب کچھ
بہت گراں پڑا سِکّے اچھال کر لانا

نہیں ہے لفظ کی بازی گری کا نام ہُنر
گہر کے ڈھب پہ ہے شبنم کو ڈھال کر لانا

۲۳/جولائی ۱۹۹۳ء

جو میں کچھ موتیوں پر ٹوٹ جاتا
مرے ہاتھوں سے دریا چھوٹ جاتا

اگر ہوتے سبھی سچ کے پجاری
کہاں بے چارہ پھر یہ جھوٹ جاتا

مقدر تھا یہ بسنا اور اُجڑنا
بساتا کوئی ، کوئی لُوٹ جاتا

جو مُڑ کر بھی ذرا مَیں دیکھ لیتا
ہزاروں سال پیچھے چھوٹ جاتا

دبانا وسعتوں کو لازمی تھا
وگرنہ یہ کنارا ٹوٹ جاتا

جو گزری مجھ پہ اس پر بھی گزرتی
تو پتھر کو پسینہ چھوٹ جاتا

۱۹/اگست ۱۹۹۳ء

دنیا میں ہم ایسے ہیں
برگ پہ شبنم ایسے ہیں

دل بے چارہ ڈوب چلا
تارے مدھم ایسے ہیں

پنہاں، اچھوتے، اَن دیکھے
کتنے عالم ایسے ہیں

خود سے ناخوش ہو بیٹھے
ہم سے برہم ایسے ہیں

کمرے کو کشمیر کریں
ہاتھ میں موسم ایسے ہیں

ساری دُنیا مُٹھی میں
جیب میں درہم ایسے ہیں

ویسے تو ہیں لوگ بہت
لوگ بہت کم ایسے ہیں

چہرہ پھیکا ہے یا پھر
شیشے مدھم ایسے ہیں

لوگ نہیں اب پہلے سے
یا پھر خود ہم ایسے ہیں

۶ ستمبر ۱۹۹۳ء

نہیں ہے فرصتِ نظارہ کارِ ذمّہ داری میں
ہُمکتا ہے مگر دل موسمِ بادِ بہاری میں

سمندر موج میں رہتا ہے وہ موجیں نہیں گنتا
ہَوا ہوجاتی ہے شبنم خیالِ خود شماری میں

یونہی لے دیکے اس دنیا میں ہم نے دن گذارے ہیں
کہاں کی زندگی ، سانسیں ملی تھیں کچھ اُدھاری میں

پہاڑ ایسے دنوں کو کاٹتے اور تھک کے سوجاتے
ہماری عمر گذری ہے خیالِ شب گزاری میں

دلِ مایوس کو کیوں آس پر زندہ نہیں رکھتے
تڑپنے سے تو اچھا ہے رہیں اختر شماری میں

ہمارا سر نہیں جھکتا کسی مغرور کے آگے
سلام افسرؔ کِیا کرتے ہیں ہم تو انکساری میں

۱۳ر ستمبر ۱۹۹۳ء

دوست کترا کے جب سے گزرنے لگے
ہم کسی اور دنیا میں رہنے لگے

یہ تعصب کی اندھی وبا خوب ہے
رنگ بھی اب نگاہوں میں چبھنے لگے

بے تکلّف ، بِلا قصد ، بر موقعہ !
اس طرح آپ آئے تو اچھے لگے

اِک جزیرہ میں دل لگ گیا تھا مگر
وہ ہَوا تھی کہ خیمے اُکھڑنے لگے

۲۰ نومبر ۱۹۹۳ء

لاش اِک پائی گئی ہے لا پتا
کس کے گھر ماتم مچے گا کیا پتا

مَیں نے دستک بھی نہ دی واپس ہُوا
گھر کے پردے سے چلا گھر کا پتا

مَیں تلاشِ گمشدہ کا اشتہار
پوچھتا پھرتا ہوں خود اپنا پتا

خود کلامی شہرِ ناپرساں نے دی
بیٹھے بیٹھے مِل گیا سب کا پتا

چار رستے چار جانب چل دیے
تم بھی چل پڑتے تو کچھ چلتا پتا

روز نکلو اِک نیا چہرہ لگائے
کس کو کیوں دیتے ہو اندر کا پتا

اور مَیں دلدل میں آ کر پھنس گیا
بہتے پانی پر پڑھا تیرا پتا

۲۰ نومبر ۱۹۹۳ء

رُک جانا کچھ کہنا سُننا ، ایسے مرے حالات کہاں
سورج بن کے نکلا ہوں مَیں ، جانے ہوگی رات کہاں

چلنا میرے بس میں ہے نہ رُکنا میرے قابو میں
رستہ میرا طے کردہ ہو ایسی مری اوقات کہاں

آنے والے کل کا ورثہ گذرے کل کا حصّہ مَیں
سانسوں کے اس لمبے سفر میں میری اپنی ذات کہاں

لمحوں کی تلواریں لیکر صدیوں لڑتے رہتے ہیں
کٹ جاتی ہے تن سے گردن، ہوتے ہیں شل ہاتھ کہاں

قطرہ قطرہ اپنے لہو کا ، گِن گِن کر مَیں بانٹ چُکا
اب جو کوئی مانگنے آئے ، پائے گا خیرات کہاں

میری آنکھیں ہیں افسرؔ ، اِک اوجھل سورج سے روشن
خوفزدہ جو کردے مجھ کو ایسی ہے یہ رات کہاں

۲۳ر نومبر ۱۹۹۳ء

اتنی سی بات پر وہ پریشان ہوگیا
اس کو ہرانا اور بھی آسان ہوگیا

دنیا کی ٹھوکروں نے مجھے سخت کردیا
مَیں آندھیوں میں کیا گھرا ، طوفان ہوگیا

ہم سے سبک سروں کیلئے کیا تھا کوہِ غم
اس مشغلے میں راستہ آسان ہوگیا

کوتاہ قامتی کے اکارت گئے علاج
مینار پر چڑھا تو مَیں حیران ہوگیا

لمحوں کی کھینچ تان میں برسوں گذر گئے
اب تو یہاں سے چلنے کا سامان ہوگیا

۱۴رمئی ۱۹۹۴ء

جو اپنے آپ کے سائے سے خوف کھاتے ہیں
ہتھیلیوں پہ وہ سورج بہت اُگاتے ہیں

نہ جانے کس نے بنایا ہے شہر کا نقشہ
تمام راستے جنگل کی سمت جاتے ہیں

وہ سادہ آدمی سمجھا نہ پایا بچّوں کو
کہ اُس کی آنکھ میں آنسو کہاں سے آتے ہیں

ہماری جھلسی ہوئی کھال کو وہ کیا سمجھیں
جو لوگ دشت میں سایہ لپیٹ لاتے ہیں

صدی اُٹھاتی ہے انساں کواور کچھ لمحے
پھر ایک بار گڑھے میں ڈھکیل جاتے ہیں

ہماری عمر کو پہنچوگے تم تو سمجھو گے
کہ گذرے وقت کا ہم سوگ کیوں مناتے ہیں

ہَوائیں تیز کرو اور تیز اور بھی تیز
کہ چند چیتھڑے دنیا میں چھوٹے جاتے ہیں

یہ آدمی نہیں چابی بھرے کھلونے ہیں
ملول شخص سے مِل کر بھی مسکراتے ہیں

صعوبتیں تو ہمیں عزم دینے آتی ہیں
انھیں بلاؤں سے ہم راستہ بناتے ہیں

ہے صبر آزما افسرؔ میاں بڑا ہونا
بگولے چڑھ کے پہاڑوں کے سر تو آتے ہیں

۲۹/اکتوبر ۱۹۹۳ء

تیرگی ہر طرف جزیروں میں
روشنی منقسم لکیروں میں

کوئی دشمن نہیں تو آخر کیوں ؟
گھِر گئے بے پناہ تیروں میں

ایسی اُلٹی بساط مت پوچھو
پِٹ گئے شاہ بھی وزیروں میں

شہر میں دِل کشی ہی کھو بیٹھے
پھول خوش رنگ تھے جزیروں میں

استعارات کی زباں سمجھو
خال و خط ہیں انھیں لکیروں میں

آج بے وقعتی میں وقت کٹا
کل نظر آئیں گے نظیروں میں

زینتِ فرقِ شاہ بن بیٹھے
آ گیا جب کٹاؤ ہیروں میں

سانس لینی محال ہے افسر
ہائے تبدیلیاں وطیروں میں

۱۷/اگست ۱۹۹۴ء

تجھے خبر نہیں اس کو خیال رہتا ہے
وہ تیرے ساتھ ہَوا کی مثال رہتا ہے

مرے لہو میں ترنگیں اسی سے ہیں جس سے
سمندروں میں تموج بحال رہتا ہے

ملال کرتے ہو کس بات کا ہوا کیا ہے ؟
یہ حادثہ تو میاں ماہ و سال رہتا ہے

تم اپنی ذات پہ جب چاہو تبصرہ مانگو
ہمارے سامنے انگلوں کا حال رہتا ہے

ملال سر کا نہیں ہے کلاہِ سر کا خیال
دِکھاتے ورنہ جو سر میں اُبال رہتا ہے

جو ہم پہ گزرے ہم اس کا پتا نہیں دیتے
یہ اور بات کہ دل میں ملال رہتا ہے

ذرا سنبھل کے ہی ملنا یہاں کے لوگوں سے
ہر آستین میں خنجر یا جال رہتا ہے

۲۲ رنومبر ۱۹۹۴ء

وہ بندۂ آزاد ہے گھر پر نہ ملے گا
اور راہ میں مِل جائے تو کُھل کر نہ ملے گا

مَیں کشتۂ یک جملۂ صد دشنہ اثر ہوں
پیوست رگِ جاں کوئی خنجر نہ ملے گا

مَیں اس پہ مٹا ہوں کہ بنانا تو اسے ہے
وہ جس سے مصوّر کوئی بڑھ کر نہ ملے گا

مَیں اپنے تئیں کچھ بھی نہیں ہوں مگر افسرؔ
اُٹھ جاؤں کسی روز تو ہمسر نہ ملے گا

۱۰/اکتوبر ۱۹۹۴ء

وہ اِک صدی کا بنائے تھا انتظام تمام
کہ ایک پَل میں ہوئی عمرِ ناتمام تمام

ابھی میں کر بھی نہ پایا تھا ایک جام تمام
نِدا یہ آئی کہ بس ہوچکی یہ شام تمام

مَیں اپنی آگ میں جلتا ہوں میرا حال نہ پوچھ
مِرا نَفَس کِیا کرتا ہے میرا کام تمام

ہَوا ہی ایسی چلی تھی اُکھڑ گئے خیمے
نہ کرسکے تھے ابھی عرصۂ قیام تمام

خوشی ہماری بجا ہے مباح فخر ہمیں
لکھی ہے مملکتِ غم ہمارے نام تمام

ٹھکانے لگ گئیں افسرؔ بچی کھچی سانسیں
چلو کہ ہو ہی گیا آج یہ بھی کام تمام

۲۲ر فروری ۱۹۹۵ء

شرم اس طرحدار چہرے پر — کھِل اُٹھا لالہ زار چہرے پر

ڈال رکھئے نقابِ رُخ یعنی — کھینچ رکھئے حصار چہرے پر

دھیمے دھیمے سُلگ رہا ہوں مَیں — پڑ رہی ہے پھوار چہرے پر

اِک یہی تو شناخت ہے میری — رحم ! پروردگار چہرے پر

صرف بے جان سے خطوط نہ کھینچ — رنگ بھی تو اُتار چہرے پر

گمشدہ ہوں مجھے تلاش کرو — ہے لگا اشتہار چہرے پر

تم نہ چاہو مگر رہے گا ضرور — عمر کا اختیار چہرے پر

تم نہیں جانتے لکھا سب ہے — نیک و بد کا شمار چہرے پر

اس کی چھب کیا بیان ہو افسرؔ
شعر کہئے ہزار چہرے پر

۱۹۹۵ء

دن تو ہمارا دشت میں گذرا، رات کٹی ویرانے میں
دامن دامن تارے ٹانکے رنگ بھرا افسانے میں

سر پر چاندی اُگ آئی ہے آنکھیں دھندلے تاروں سی
دنیا ہم کو سمجھی لیکن عمر لگی سمجھانے میں

دن تو پونچھے رات کی کالک، دن کی سفیدی چھینے رات
اُلٹا ہی احسان کا بدلہ ملتا ہے لوٹانے میں

آنکھیں موند کے سونے والو کچھ تو بولو کیسے ہو
ساتھ تمھارے ہم بھی ہونگے دیر ذرا ہے آنے میں

کیسا مداوا کیسا مرہم ان کا مذاق اور اپنا غم
زخم جو بھرنے آئے تھے افسر تازہ ہوئے دِکھلانے میں

۱۹۹۵ء

مجھے بنا کے مہاجر وہ چل دیا جیسا
کوئی وطن سے نہ بچھڑے کہ مَیں چھُٹا جیسا

مَیں زخمیوں کی کراہوں کے جنگلوں میں گُم
ہوں ایک بجھتے ہوئے تیر کی صدا جیسا

مری رگوں میں لہو تھا کہ گرم پارہ تھا
اُڑائے پھرتا رہا جو مجھے گھٹا جیسا

مرے کہے یا کئے سے تو کچھ نہیں ہوگا
تو پھر وہی نہ کروں مَیں کہے خدا جیسا

مرے قریب سے گذرو تو مجھ سے مت مِلنا
ذرا سا جسم کو چھونا مگر ہَوا جیسا

گھٹائیں روز گذرتی تو ہیں برستی نہیں
بچھا ہُوا ہوں پہاڑوں پہ میں رِدا جیسا

مرے خدا مجھے ذرّات میں بدل دیجو
جو میری ذات میں پیدا ہو اِک خلا جیسا

وہ اپنا قُرب ذرا دوریوں پہ رکھتا ہے
قریب رہ کے بناتا ہے فاصلہ جیسا

۱۹۹۵ء

تمھاری زندگی اِک گونج ہاؤ ہوٗ کی ہے
خموشیوں سے کہاں تم نے گفتگو کی ہے

امید یافت کی رکھتے تو مر نہیں جاتے؟
ہمیں تو طرفہ خوشی جہدِ آرزو کی ہے

کبھی کبھار بہکنا سرشت آدم ہے
خطا تو ہم نے بھی یارو کبھو کبھو کی ہے

پلا سکو تو انا کو لہو کے گھونٹ پلاؤ
یہ بات قد کی نہیں ظرف کے نمو کی ہے

امید ایسی ندی ہے جو سوکھتی ہی نہیں
کہ اس کی تہہ میں جو اِک رو ہے وہ لہو کی ہے

نہ دن کو رات پکڑ پائے اور نہ رات کو دن
مثال یہ بھی تو اِک شوقِ جستجو کی ہے

۱۹۹۶ء

مرا خدا جو کرے عمرِ حاسدین دراز
ہوا کرے قدِ اشعار دل نشین دراز

زمانہ اگلے بزرگوں کا تھا فراغت کا
طنابیں کھینچ کے کرتے تھے جو زمین دراز

عجیب وضع نکالی ہے اب کے لوگوں نے
کہ جامہ جیب ندارد اور آستین دراز

پلٹ کے دیکھنے والوں کو دیکھ لیتے ہیں
اگرچہ کرتے نہیں ہیں نظر حسین دراز

تعلق اور بھی بڑھتا ہے کھو کے پانے پر
شکوک ہی نے کیا ہے قامتِ یقین دراز

جھکی ہی رہتی ہے وہ شاخ جو ثمرور ہے
حیا سے ہوتے نہیں دستِ نازنین دراز

یہ سلسلہ ابھی جاری رہے تو بہتر ہے
لہو جلا کے کرو یہ شبِ حسین دراز

۱۰ر جولائی ۱۹۹۶ء

سماعت لذّتِ اظہار میں گُم
ذہانت کرب کے آزار میں گُم

خزاں اشجار سے پتّے گرائے
نظر آئندہ کے آثار میں گُم

وہ اِک وحشی ابھی تک ناچتا ہے
تمدّن گردشِ ادوار میں گُم

اندھیرے کی حکومت اب چلے گی
ہُوا دن شام کے آثار میں گُم

مضامیں صف بہ صف ماتم کناں ہیں
ہے شاعر نُدرتِ افکار میں گُم

ابھی تک گھر جسے کہتے تھے افسرؔ
ہُوا اینٹوں کے اِک انبار میں گُم

۱۹۹۶ء

وضع کا پاس وہی لوگ بجا رکھتے تھے
سر سے اُٹھتے ہوئے شعلے جو دبا رکھتے تھے

ہم سے مل کر بھی کوئی ہم کو نہ پایا ہے کہ ہم
آگے اِک آئینہ دیوار نما رکھتے تھے

ہم کو مطلق نہ رہا رنجِ گراں باریٔ غم
بوجھ ہم سر پہ نہیں دل میں چھپا رکھتے تھے

آج ہی پایا ہے ہم نے نہ ہوا کل ہی نصیب
اپنے ہر آج کو ہم کل پہ اُٹھا رکھتے تھے

شجرِ ناموری یونہی نہیں ہے شاداب
شہرِ بے آب میں افسرؔ بھی ہوا رکھتے تھے

۱۹۹۶ء

سُناتا مَیں بھی مگر ختم کُل فسانہ ہُوا
بیاضِ عمر کو بکھرے ہوئے زمانہ ہُوا

اُڑا کے لے گئی آندھی مرے اثاثے کو
سفر سے پہلے ہی رختِ سفر روانہ ہُوا

جمی جو رشتوں پہ سیلن زدہ عدم پرسی
یہی وہ وقفہ تھا دیمک کو جو بہانہ ہُوا

میانِ جنگ کبھی ڈھال مَیں نہیں رکھتا
وہ ڈھال رکھتا ہے خود کو جسے بچانا ہُوا

ادھورے آدمی اب اس کا امتحاں لینگے
تماشا ہوگیا گویا خدا خدا نہ ہُوا

سمندروں سے پرے روشنی زیادہ ہے
خود اپنے گھر کو جلانے کا یہ بہانہ ہُوا

مَیں اپنی سانس کو گرما سکوں غنیمت ہے
تمام شہر تو گویا کہ برف خانہ ہُوا

اُجاڑ رات میں روشن تھا چاند کی صورت
جو صبح روشنی لائی تو میں روانہ ہُوا

وہیں تو آج بھی ٹھیرا ہُوا ہے دل افسرؔ
شبِ قرار کو گذرے زمانہ ہُوا

۲۱؍جنوری ۱۹۹۷ء

مجھے یاد ہے مرا آشیاں سرِ شاخسار ہَوا پہ تھا
وہ بنا گئی مجھے بے مکاں کہ مِرا مدار ہَوا پہ تھا

مَیں تو پاؤں اپنے جما گیا تُو اُڑا کِیا تو اُڑا کیا!
مِرا انکسار تھا خاک پر ترا افتخار ہَوا پہ تھا

پئے سیرِ گل تو گئے سبھی، وَلے کب کسی کی نظر پڑی
مَیں مثالِ قطرۂ شبنمی سرِ شاخسار ہَوا پہ تھا

جو چلا گیا سو چلا گیا، مَیں سفینہ اپنا بچا گیا
یہ نہ دیکھئے کہاں آ گیا، کسے اختیار ہَوا پہ تھا

کسی ایک رُخ پہ نہ چل سکا نہ میں شمع بن کے پگھل سکا
نہ مَیں بجھ سکا نہ مَیں جل سکا مِرا انحصار ہَوا پہ تھا

مِری کُل متاع اُڑا گئی، مِرا سب گمان بھُلا گئی
وہ تو ایک پل میں چکا گئی جو مِرا اُدھار ہَوا پہ تھا

نہ پتا چلا نہ ہوئی خبر، وہ ملی کہاں وہ گئی کدھر
وہ تھی میری عمرِ عزیز تر یا کوئی سوار ہَوا پہ تھا

۱۲ر جنوری ۱۹۹۷ء

عجیب سودا ہے یہ جستجوئے لا معلوم
کہاں کہاں مجھے لیکر پھرے گی کیا معلوم

کبھی تو آئے گا دریا کو ڈوبنے کا خیال
کبھی تو ہوگا سمندر کا راستہ معلوم

مگر یہ عزم کہاں چین لینے دیتا ہے
اگرچہ ہو گیا قسمت کا فیصلہ معلوم

ہمارا خاک میں ملنا ابھی تو باقی ہے
ابھی سے رقص میں کیوں یہ جہاں ہے کیا معلوم

بساط رکھتی ہیں بوندیں ملیں تو بحر بنے
دھواں دھوئیں میں مِلا بھی تو کیا بنا معلوم

۲۷ر جنوری ۱۹۹۷ء

تمھارے خواب میں خود کو جگا کے سویا ہوں
نہیں رہوں گا مگر یوں لگے گا گویا ہوں

خدا کرے کہ ترا دن ہنسی خوشی گذرے
تمام رات تو سویا ہے اور مَیں رویا ہوں

تمام راستے پھر مجھ میں ہی روانہ ہوئے
سفر کے بعد خیالِ سفر میں کھویا ہوں

تم اپنے ذوق کی لَو تیز کر کے دیکھو تو !
وَرَق وَرَق میں وہ کہتا ہے مَیں سمویا ہوں

وہ ایکبارگی خوابوں کا خاک ہوجانا
ہزار بار میں اس سانحے پہ رویا ہوں

مجھے یہ فیصلہ کرنا بھی آج مشکل ہے
کہ پا گیا ہوں تجھے یا مَیں خود میں کھویا ہوں

۱۹۹۷ء

اِدھر اِک پل ہمیں بھاری بہت ہے
اُدھر امداد ! اخباری بہت ہے

گلوں کی ناز برداری بہت ہے
مگر یہ چیز ہی پیاری بہت ہے

ہماری خوں فشانی کی نہ پوچھو
چٹانوں پر بھی گلکاری بہت ہے

ذرا میں راکھ ہو جاتا ہے سب کچھ
کہ خار و خس کو چنگاری بہت ہے

اگرچہ عیش کے قائل ہیں ہم بھی
مگر یہ شوق بازاری بہت ہے

پرائی چیز اس کو جانتا ہے
مگر انساں کو جاں پیاری بہت ہے

فقیر آداب کا قائل نہیں ہے
ترا انداز سرکاری بہت ہے

بہت اُکتا گیا ہے آج انساں !
دِلوں میں آج بیزاری بہت ہے

دماغ اس کو کہاں افسؔر کو سمجھے
کہ اس سر پر کلہ بھاری بہت ہے

۱۹۹۵ء

رتجگوں کی رُت گئی پھر رات بھر جاگا کئے
ان پہاڑ ایسے دِنوں میں کیا کریں سوچا کئے

عالمِ حیرت میں کب تھی فرصتِ نظارگی
آئینہ بن کر تری صورت کو ہم دیکھا کئے

جانے کب لیجائے سوداگر کسے معلوم ہے
ایک مدت ہوگئی ہے جان کا سودا کئے

خاک ہونا تو مقدر تھا مگر جلتے ہوئے
ہم تری آنکھوں میں اپنی روشنی دیکھا کئے

بے حجابانہ ترا آنا ہمیں بھولا نہیں
اِک زمانہ ہوگیا ہے گو تجھے پردا کئے

اے ہَوائے سیرِ دنیا کیا غضب تو نے کیا
وہ چراغِ چشم جو روشن یہاں تھے کیا کئے؟

موت کو ٹھیرے ہوئے تالاب کا دے کر شکوں
زندگی کے واسطے اس نے بھنور پیدا کئے

سلسلہ در سلسلہ ہے درد کی یہ داستاں
تم کہاں پھرتے ہو افسرؔ زخمِ دل تازہ کئے

۱۰/اپریل ۱۹۹۵ء

ہم کو تو اس مکان کا ڈر چھوڑتا نہیں
جو واپسی کے واسطے در چھوڑتا نہیں

جاں ساتھ چھوڑ دے یہ الگ بات ہے مگر
اہلِ ہُنر تو کسبِ ہُنر چھوڑتا نہیں

چہرے کی جھرّیوں میں یہ تحریر پاؤ گے
کہتا ہے کون وقت اثر چھوڑتا نہیں

فرصت ذرا جو پاؤں تو سیرِ فلک کروں
مشکل یہ ہے کہ پاؤں کو گھر چھوڑتا نہیں

سیکھا کہاں ہے تم نے کسی دل میں ڈوبنا
تم کو تو زندگی کا بھنور چھوڑتا نہیں

افسرؔ پہ جانے کون سی آفت گذر گئی
یوں راہ میں وہ رختِ سفر چھوڑتا نہیں

۱۹۹۵ء

دور تک اِک خامشی طاری رہی
اندر اندر جنگ بھی جاری رہی

قاعدہ محبوس اور قانون قید
میز کے پیچھے ہی الماری رہی

دی نہ حیرانی کی مہلت بھی ذرا
آخری اِک ضرب جو کاری رہی

دشمنوں کا پوچھتے ہم کیا مزاج
دوستوں کے دل میں بیماری رہی

وہ جو دشمن تھا وہ دشمن تھا کھُلا
یار جو تھے اُن میں عیاری رہی

علم کی خوشبو نہ تھی افکار میں
عمر بھر اسناد برداری رہی

۱۹۹۷ء

مزاج وحشی تھا، تن پر لباس رکھتا تھا
وہ اپنے آدمی ہونے کا پاس رکھتا تھا

بلا کی تلخیاں گھولے گیا زمانہ مگر!
ہمارا دل بھی غضب کی مٹھاس رکھتا تھا

بچا رہے وہ مخاطب کو سامنے لا کر
اسی لئے تو وہ آئینہ پاس رکھتا تھا

کسی بھی کام نہ آئی سند فضیلت کی
بڑھا وہی جو زبانِ سپاس رکھتا تھا

بجھا دیا اسے شبنم کی بے ثباتی نے
ہمارا دل جو سمندر کی پیاس رکھتا تھا

۲۰ جون ۱۹۹۷ء

ہے یہ کس اُلجھن، پریشانی میں دھوپ
آج کیوں اُتری نہیں پانی میں دھوپ

رات کے ٹھٹھرے ہوئے لمحات کو
سینکتی ہے اپنی نگرانی میں دھوپ

دو پہر کے وقت سناٹے کے بیچ
کھِل اُٹھی کچھ اور ویرانی میں دھوپ

برف کیا پتھر کو بھی پگھلا گئی
کس قدر تھی آنکھ کے پانی میں دھوپ

ڈھل گیا دن ہاتھ کچھ آیا نہیں
پڑ گئی ہے زرد حیرانی میں دھوپ

۲۰ جون ۱۹۹۷ء

وہ دشت میں بھی کئی گل کھِلا کے نکلے ہے
ترا خیال جسے گد گدا کے نکلے ہے

پُرانا قصّہ ہے یہ قُرب اور جدائی کا
ہنسانے والا جو نکلے رُلا کے نکلے ہے

ہمارے لہجے میں خنکی کہاں سے پاؤ گے
جو سانس نکلے ہے دل کو جلا کے نکلے ہے

عجیب فتنہ ہے یہ آدمی کی ذات کہ وہ
رہے جو خُلد میں دوزخ بنا کے نکلے ہے

ہم ایسا وضع کا پابند کیا کرے آخر ؟
کہ کام دنیا میں بس دے دِلا کے نکلے ہے

زمانہ ہم سے مِلا اور نہ ہم زمانے سے
کہ رات صبح سے دامن بچا کے نکلے ہے

بہائے سجدہ ملے خُلد یہ خیال افسرؔ !
ہے تیرا قرض جو ذمّے خدا کے نکلے ہے ؟

۶ر جولائی ۱۹۹۷ء

تُو زندگی کی رمق کا نشاں تو رہنے دے
نہیں ہے روشنی لیکن دھواں تو رہنے دے

تو ڈوبتے سے یہ تنکے کا آسرا تو نہ چھین !
یہ چھت ہٹا لے مگر آسماں تو رہنے دے

سوادِ ساحلِ ذلت مجھے قبول نہیں
مَیں اپنی موج میں ہوں بے نشاں تو رہنے دے

یہاں تو صرف عقابوں کا راج چلتا ہے
کبوتر امن کا ہے اِک نشاں تو رہنے دے

مَیں خود ہی پوچھوں گا اِک روز آندھیوں کا مزاج
مری رَگوں میں مرا خوں رواں تو رہنے دے

مَیں حادثات میں گھِر کر ہی سانس لیتا ہوں
اگر یہ وقت ہے نا مہرباں تو رہنے دے

کشیدگی سے تعلق میں حُسن آتا ہے
ذرا سی دیر اسے بدگماں تو رہنے دے

۲۳/جولائی ۱۹۹۷ء

تمام عمر تھا دل پر ملال جینے کا
قضا جو آئی تو آیا خیال جینے کا

چٹانیں توڑ کے چشمہ رواں ہُوا کہ نہیں
دباتا کوہ کہاں تک اُبال جینے کا

قضا کا خوف ہی دوڑے ہے زندگی بن کر
ہے موت ہی میں تو مضمر کمال جینے کا

کھلے ہیں قطرۂ باراں گلاب کی صورت
تو آدمی ہے تو مقصد نکال جینے کا

خدا کے ہوتے انھیں کیوں خیال بھی آتا
کہ دشت میں تو نہیں نونہال جینے کا

بلا کا صبر اِدھر اور غضب کی پیاس اُدھر
مزہ ہے اور میاں خستہ حال جینے کا

اب اس کی موت کا صدمہ رہے گا مرنے تک
وہ دے گیا ہمیں کیسا ملال جینے کا

ہر ایک سانس کے ہمراہ یہ خیال آئے
کہ صرف موت ہے آخر مآل جینے کا

یہاں تو لمحہ بہ لمحہ قضا کا دھڑکا ہے
منائیں جشن کہاں سال سال جینے کا

میں تارے توڑ لایا لوگ افسرؔ
فَعَل اور فَعْل کی گردان میں ہیں

دسمبر ۱۹۹۷ء

جو کچھ بھی تھا ہمارے فسانے میں جل گیا
اِک داغ تھا سو آج دِکھانے میں جل گیا

ہم سعیٔ ترکِ عشق میں برباد ہو گئے
سارا مکان آگ بجھانے میں جل گیا

اس شہرِ باکمال میں ایسے بھی لوگ ہیں
جن کا چراغ آندھیاں لانے میں جل گیا

یہ راکھ اُڑ کے آئی ہے اُس سبزہ زار سے
جس کا وجود پچھلے زمانے میں جل گیا

مَیں وہ فریب خوردۂ آبِ حیات ہوں
صحرا بھی جس کی پیاس بجھانے میں جل گیا

خورشید جانتا ہے تپش صیدِ عشق کی
جس کی کرن کا تیر نشانے مَیں جل گیا

فروری ۱۹۹۸ء

ہم سے سیکھو دوسروں کے غم میں جینے کا حساب
خون کا کیوں ہم تو دیتے ہیں پسینے کا حساب

یوں سمندر کے کنارے بیٹھ کر موجیں نہ گن
بڑھ طلب کر بحر سے اِک اِک سفینے کا حساب

ہم خزانے چھوڑ آئے فرش پر بکھرے ہوئے
لوگ ہم سے پوچھتے کیوں ہیں خزینے کا حساب

جنگلوں میں زندگی کے کچھ قرینے پاؤ گے
شہرِ مردہ میں نہیں آئے گا جینے کا حساب

دو میں دو شامل کیا اور لوگ آگے بڑھ گئے
ہم شریفوں کو نہ آیا اس قرینے کا حساب

خود پیاسے تھے مگر سیراب دُنیا کو کِیا
ان سے پوچھو صبر کا اِک گھونٹ پینے کا حساب

ضرب کچھ ایسی پڑی تقسیم ہو کر رہ گئے
ہم سِکھانے آئے تھے دنیا کو جینے کا حساب

۱۸ر مئی ۱۹۹۸ء

رفتہ رفتہ اس نہج پر زندگی لائی گئی
جب چلے جائیں ، لگے گا جیسے پروائی گئی

اب چنبیلی کے وہ منڈوے ہیں نہ رانی رات کی
اُف دُکانوں کے ہی چکّر میں تو انگنائی گئی

ہوگیا دیدہ شنیدہ تب کہیں آنکھیں کھلیں
آنسوؤں کے ساتھ بہہ کر ساری بینائی گئی

جس کو چلنا تھا رُکا ہے ، رُکنے والا چل پڑا
نام پیچھے رہ گیا اور آگے رسوائی گئی

کتنی فصلیں بانجھ ہوجاتی ہیں کچھ معلوم ہے
ایک پودے سے اگر اِک شاخ کٹوائی گئی

ہم اندھیرے میں جو بیٹھے تھے سو بیٹھے رہ گئے
روشنی کا پوچھنا کیا وہ تو یوں آئی گئی

جب ستاروں کی دُلائی آسماں لیتا گیا
دھوپ کی چادر ہمارے سر پہ پھیلائی گئی

بند رکھ سکتے ہیں ہندسوں کو یہ قوس و دائرے
اس طرح کیا قید میں خوشبو کبھی لائی گئی

رات کے دامن میں تارے ٹانک کر ہم سو گئے
صبح تک وہ بات ساری ہوگئی آئی گئی

اپنا قصہ آپ کہہ کر سُن لیا اور چُپ ہوئے
ہم سے گویائی سماعت کو نہ ترسائی گئی

۲۸ر ستمبر ۱۹۹۸ء

زمیں تھی صدیوں کی اور آسماں تھا صدیوں کا
رہا میں کم ہی مگر میہماں تھا صدیوں کا

کسی کے ذہن میں آتش فشاں تھا صدیوں کا
مری نگاہ کے آگے دھواں تھا صدیوں کا

وہ انگلیوں پہ گناتا رہا ہر اِک احساں
حساب ہم نے رکھا ہی کہاں تھا صدیوں کا

پلک جھپکتے یوں گزرے کہ کچھ خبر نہ ہوئی
وہ چند لمحے کہ جن پر گماں تھا صدیوں کا

لبوں پہ سوکھی زباں بار بار پھرتی تھی
نظر کے سامنے سوکھا کنواں تھا صدیوں کا

تمھارے لمحوں کی سوچوں نے ڈھا دیا اِک دن
تمھارے شہر میں جو اِک مکاں تھا صدیوں کا

یہی سبق مِلا دیمک زدہ کتابوں سے
جو نفع پل کو مِلا وہ زیاں تھا صدیوں کا

گلے مِلا وہ مگر کتنی احتیاط کے ساتھ
کہ میرا یار جو تھا بدگماں تھا صدیوں کا

۱۹۹۸ء

یہاں ڈوبے وہی ہیں جن سے پتواریں نہیں چلتیں
سفینہ تم بڑھا لوگے تو منجدھاریں نہیں چلتیں

دِلوں کو ہاتھ میں رکھنے سے ملتی ہے ہمہ گیری
فقط سِکّے چلا دینے سے سرکاریں نہیں چلتیں

ہَوا کے نرم جھونکوں نے بھی اکثر معرکے جیتے
امورِ سلطنت میں صرف تلواریں نہیں چلتیں

یقیں دل سے، زباں سے، اور عمل سے لازمی ٹھیرا
خدا کے پاس خالی سر کی ہنکاریں نہیں چلتیں

اگر قانون ہے تو زندگی سے منضبط کیجے
فقط دھاراؤں سے یہ سوچ کی دھاریں نہیں چلتیں

تماشا بیں طبیعت ہوگئی ہے اہلِ دنیا کی
دھماکے گر نہیں ہوتے تو سرکاریں نہیں چلتیں

۲۹ ستمبر ۱۹۹۸ء

طبیعت اب رواں رہنے لگی ہے ندی میدان میں بہنے لگی ہے

ذرا اس شور و غل کو چُپ کراؤ خموشی داستاں کہنے لگی ہے

سجانا گھونسلا دانے بھی لانا یہ دُکھ کیوں فاختہ سہنے لگی ہے

نہیں ہے جگنوؤں کا بھی اُجالا پریشاں چاندنی رہنے لگی ہے

کہیں سیلاب گھر میں آ نہ جائے سڑک دیوار سے کہنے لگی ہے

جواب آئے نہ آئے کون جانے ہمیں اِک عمر تو کہنے لگی ہے

وہ ہنستی ناچتی خود کار گڑیا ذرا سہمی ہوئی رہنے لگی ہے

وہ جو دیوار ہے دریا کا پشتہ وہی دیوار اب ڈھنے لگی ہے

چلو دیوار ہی کے کان کھینچیں سماعت اب کہاں رہنے لگی ہے

حقیقت میں جو گزری اور کچھ تھی کہانی اور کچھ کہنے لگی ہے

نہیں ہے غم کو کچھ آزار افسرؔ
خوشی تکلیف میں رہنے لگی ہے

۱۲/اکتوبر ۱۹۹۸ء

اک سکوں پانے سے ہر ذی ہوش ہے قاصر بہت
گرچہ سامانِ سکوں ہیں شہر میں وافر بہت
حال یہ ہے سر کے پیچھے کی خبر رکھتا نہیں
آدمی سمجھے ہے اپنے آپ کو قادر بہت
اِک مسافر کی طرح اپنا سفر جاری رہا
فکرِ منزل کر رہی تھی راہ میں خاطر بہت
یہ جو دنیا ہے بڑے ہی معرکے کی چیز ہے
اہلِ ایماں کو بھی خوش آتی ہے یہ کافر بہت
حوصلہ دَم لے چکا ہے زخم بھی اب بھر چلے
دشتِ محرومی کی یاد آنے لگی ہے پھر بہت
اس کا گھاٹا فائدہ اپنا ہوا ہے یہ جان کر
آدمی تو وہ بہت ہی کم ہے اور تاجر بہت
اس کے باطن تک پہنچنے میں مزہ آجائے گا
وہ جو اپنے آپ کو کرتا نہیں ظاہر بہت
اور بھی عیّار ہوتا جا رہا ہے ان دنوں
فطرتاً ویسے بھی یہ انسان تھا شاطر بہت
خار دیدہ زخم پا مخمل طلب کرنے لگے
ہم نہ کہتے تھے کہ شہروں میں نہ تُو یوں پھر بہت
موت لمبی نیند لیکر آئیگی معلوم ہے
آدمی مرتا ہے لیکن نیند کی خاطر بہت
ایسی شہرت سے تو افسؔر اپنی گمنامی بھلی
شعر نا مقبول ہوں مشہور ہو شاعر بہت

۲۸ر نومبر ۱۹۹۸ء

اندھیرے گھر کی روایات توڑ جانا ہے
ہمیں چراغ اُجالے میں چھوڑ جانا ہے

نہیں ہے مصرفِ جان اور کچھ مگر یہ ہے
تمام عالمِ امکاں جھنجھوڑ جانا ہے

وہیں سے ترکِ تعلق کی راہ نکلی ہے
جہاں سے تم نے محبت کا موڑ جانا ہے

ہے خواہشات سے چھٹنا اگر تو یوں سمجھو
کہ بس حصار ہوا ہی تو توڑ جانا ہے

ہماری خامشی بے وجہ تو نہیں افسرؔ
اسی کو زہرِ تکلّم کا توڑ جانا ہے

۲۸ نومبر ۱۹۹۸ء

تمام زندگی رِس رِس کے خوں نکلتا ہے
مگر دماغ سے کب یہ جنوں نکلتا ہے

عجیب لوگ ہیں ناحق کو حق بتاتے ہیں
کسی کی چھت سے کسی کا ستوں نکلتا ہے

نہ روکتا ہمیں لیکن ، وہ پوچھ تو لیتا
ہے کون شخص جو محفل سے یوں نکلتا ہے

گرفت میں اگر آجائے بھی یہاں قاتل
تو پشت پر کوئی دستِ دروں نکلتا ہے

قمار خانۂ ہستی کسی کو راس نہیں
جو سرفراز گیا سر نگوں نکلتا ہے

کبھی کسی کی حقیقت بھی خواب ہوتی ہے
کسی کا خواب حقیقت فزوں نکلتا ہے

کوئی بھی قید اسے روکنے سے قاصر ہے
جسے نکلنا ہے افسؔر وہ یوں نکلتا ہے

۲۹ رنومبر ۱۹۹۸ء

زندگی ہم نے جو پھولوں میں گزاری ہوتی
آپ کی زلف بھلا کس نے سنواری ہوتی

آب جاتی تو کہیں آب میسّر آتا
پیاس پھر کیوں نہ انھیں جان سے پیاری ہوتی

مَیں ہی تھا جس نے تمھیں حسن کا جادو بخشا
مَیں نہ ہوتا تو کہاں خاک تمھاری ہوتی

پوچھتے پھرتے نہ تم اپنا نشاں لوگوں سے
اپنی پہچان جو کاغذ پہ اُتاری ہوتی

کون سے زعم نے یوں ڈھیٹ بنایا ہے تمھیں
خوف ہوتا جو ذرا نیند نہ پیاری ہوتی

کچھ تو اے زندگی آسان بنایا ہوتا
دن تھا جب اتنا کڑا، رات نہ بھاری ہوتی

اِک کشش اپنی زمیں رکھتی ہے ورنہ افسرؔ
آسمانوں سے پرے اپنی سواری ہوتی

۷ رجنوری ۱۹۹۷ء

جانبِ ارض وطن جب یہ قدم جاتے ہیں
اپنی دانست میں ہم سوئے ارم جاتے ہیں

تو نے اس طور سے رخصت نہیں دیکھی ہوگی
گردشِ وقت ذرا ٹھہر کہ ہم جاتے ہیں

دن بہ دن زور پہ ہے گرمئ بازار طلب
ہم بھی اب بستئ دل میں ذرا کم جاتے ہیں

ساتھ ہولینگے کسی روز جو چلنا ہوگا
قافلے روز ہی تو سوئے عدم جاتے ہیں

کچھ نہ کچھ بات تو ہے حُسن و جوانی میں کہ لوگ
اُس گلی سے جو گذرتے ہیں تو رم جاتے ہیں

لوگ اخلاص و محبّت سے یوں ڈرتے کیوں ہیں
پیار سے بات بھی کیجے تو سہم جاتے ہیں

ہے کشش کوئی لئے جاتی ہے افتاں خیزاں
ورنہ نالے تو ذرا دیر میں تھم جاتے ہیں

۸؍جنوری ۱۹۹۹ء

کہاں اب وہ روانی رہ گئی ہے
فقط شورش زبانی رہ گئی ہے

سبکدوشی ہوئی حاصل تو کیا ہے
طبیعت میں گرانی رہ گئی ہے

قریب الختم ہے قصہ ہمارا
بہت تھوڑی کہانی رہ گئی ہے

چلو اچھا ہُوا احباب آئے
فقط اب موت آنی رہ گئی ہے

تمھاری یاد بھی اب چھوڑ دیں ہم؟
یہی تو اِک نشانی رہ گئی ہے

بہت آگے نکل آیا ہے افسرؔ
بہت پیچھے جوانی رہ گئی ہے

۱۷ر جنوری ۱۹۹۹ء

نہ تڑپاؤ ! اگر بہلا سکو تو چلے آؤ ! اگر تم آ سکو تو
ہرا کیا ہے ابھی تھا اب نہیں ہوں لو دُہراؤ اگر دُہرا سکو تو
تمازت مہر میں اب وہ نہیں ہے سو جھٹلاؤ اگر جھٹلا سکو تو
بلندی سے وہ پستی میں چلا ہے تو ٹھیراؤ اگر ٹھیراؤ سکو تو
تمھاری زُلف میں وہ خم کہاں ہے سو اُلجھاؤ اگر اُلجھا سکو تو
بہت رکھتے ہو دنیا کی سمجھ تم تو سمجھاؤ اگر سمجھا سکو تو
کسی کے کام آنا کام جانو ! پھر آجاؤ اگر تم آ سکو تو
زمیں اپنی سکڑتی جا رہی ہے تو پھیلاؤ اگر پھیلا سکو تو
اسی مٹی سے رگڑو جو ہے میری یوں چمکاؤ اگر چمکا سکو تو

یہ دنیا ہے وبالِ جان افسر
نہ ٹھکراؤ اگر ٹھکرا سکو تو

۱۹۹۸ء

بات تو کچھ نہ کچھ رہی ہوگی
شمع یوں ہی نہ بجھ رہی ہوگی

لیکے انگڑائیاں وہ شامِ غزل
صبح بستر سے اُٹھ رہی ہوگی

سرخ ڈورے سے ہوں گے آنکھوں میں
رات کی نیند چبھ رہی ہوگی

دوستوں کا سلوک ایسا تھا
دشمنی جیسے کچھ رہی ہوگی

مختلف انگلیوں کا سلجھانا
ڈور تو اور گتھ رہی ہوگی

ہم جسے توڑنے میں ٹوٹ گئے
پھر وہ دیوار اُٹھ رہی ہوگی

تیر تو اس طرف نہیں آیا
بات سینے میں چبھ رہی ہوگی

پیاس کا حال پوچھتے کیا ہو
کچھ بجھی ہوگی کچھ رہی ہوگی

یہ جو قندیلِ مہر ہے افسرؔ
شام ہوتے ہی بجھ رہی ہوگی

یکم رفروری ۱۹۹۹ء

ہوا سے جب نہ بنی بادباں اُتار دیے
سفینے ہم نے بموجِ رواں اُتار دیے

تپا کے دھوپ میں کندن بنا دیا مجھ کو
وہ جس نے سر سے مرے سائباں اُتار دیے

کسی کی حد میں نظر بھی گزر نہیں سکتی
یہ رہبروں نے کہاں کارواں اُتار دیے

ہمارا غم نہیں اُس فکر کی تو فکر کرو
وہ فکر جس نے رُخِ گل رُخاں اُتار دیے

فلک سے ٹوٹ کے گرتے ہیں رات بھر تارے
زمیں جو کہتی ہے اے آسماں ! اُتار دیے

مزہ زباں کا ہمارے بیاں میں آتا ہے
کہ ایک شعر میں سو سو جہاں اُتار دیے

غنیم تاک میں بیٹھا تھا جب نظر چوکی
تو دل میں لشکرِ وہم و گماں اُتار دیے

میں تپتی ریت سے کُنجِ چمن میں جا پہنچا
یہ تم نے یاد کے زینے کہاں اُتار دیے

اب آسماں سے اُترنے کا غم نہیں افسرؔ
کہ اس نے دل میں کئی آسماں اُتار دیے

۲۶ر فروری ۱۹۹۹ء

اُجاڑ ہوگئی بستی ترے سنورنے تک
کواڑ تک نہ کھُلے دستکوں کے مرنے تک

نہ جانے کیا ہُوا پت جھڑ گئی نہیں اب کے
کہ ایک گل نہ کھِلا فصلِ گل گذرنے تک

اسیرِ موجِ بلا ہے اکیلی جان مری
اُبھر گئے کئی طوفاں مرے اُبھرنے تک

سوال درد کا ہوتا تو ہم دوا کرتے
یہاں تو سلسلہ اِک چاہیے تھا مرنے تک

دھواں نہیں تھا جو اُٹھ کر ہوا میں مل جاتا
مَیں اپنے آپ میں سمٹا رہا بکھرنے تک

سوال اب نہیں باقی حصولِ مقصد کا
گزر گئے کئی عالم سوال کرنے تک

بلندیوں کے بُلاوے ہمیں رجھا نہ سکے
فلک کے ہم جو گئے بھی تو صرف جھرنے تک

عجیب شہر تھا افسر عجیب رسمیں تھیں
وہاں حدیں تھیں مقرر سلام کرنے تک

۲۷ر جولائی ۲۰۰۰ء

زباں کو اب مزا لگنے لگا ہے
بُرا ہونا ، بھَلا لگنے لگا ہے

بھلے پن کا زمانہ اب نہیں ہے
بھَلا ہونا بُرا لگنے لگا ہے

بہت سفّاک ہے اب ہاتھ اس کا
نشانہ بے خطا لگنے لگا ہے

کہاں لگتا تھا دنیا میں مرا دل
تمھیں نے تھا کہا لگنے لگا ہے

ہے اب اس مرحلے میں عمر افسرؔ
سہارے کو عصا لگنے لگا ہے

۱۹۹۹ء

ذرا سی دیر میں عالم کو پیچ و تاب ہُوا
سکوں نے شکل جو بدلی تو اضطراب ہُوا

پتنگ ڈور سے ٹوٹی تو پھر کبھی نہ مِلی
خیال ہاتھ سے چھوٹا تو ایک خواب ہُوا

برہنگی پہ اُتر آئے خار کچھ نہ ہُوا
گلوں کا خندۂ پنہاں بھی اِک عذاب ہُوا

خراب اپنے کو سمجھو اسی میں خوبی ہے
جو خوب اپنے کو سمجھا وہی خراب ہُوا

۲۰۰۱ء

جو برسا ابر جل تھل چھوڑ آیا
ہٹا پانی تو دَل دَل چھوڑ آیا

لگا دی آگ بستی راکھ کر دی
مَیں کن ہاتھوں میں مشعل چھوڑ آیا

جو دیکھے عقل کے پتلے تو شیطاں
انھیں لوگوں میں اکثل چھوڑ آیا

پہاڑوں پر بہت برسا وہ کل شب
سمندر کو جو بادل چھوڑ آیا

اے لُو کے گرم جھونکو مَیں وہی ہوں
جو ٹھنڈی رُت کا آنچل چھوڑ آیا

بچا کر کون رکھتا زندگی بھر
مِلا اِس پَل تو اُس پَل چھوڑ آیا

اِدھر سر گوشیاں چلاّ رہی ہیں
مَیں کیوں یادوں کا جنگل چھوڑ آیا

اُڑی تو تھی تری زلفوں سے خوشبو
مگر جھونکا تھا چنچل چھوڑ آیا

مارچ ۱۹۹۹ء

پیڑ کا عکس پانی میں اچھا لگا
شاہزادہ کہانی میں اچھا لگا

شعر گوئی میں تُو جاں کھپاتا ہے کیوں
دِل ذرا شعر خوانی میں اچھا لگا

گر نہیں پھول تو پنکھڑی ہی سہی
جو دِیا مہربانی میں اچھا لگا

اب یوں لگتا ہے گویا بڑی بھول کی
دل کا لگنا جوانی میں اچھا لگا

۲۰۰۱ء

سوچ کا کچھ تو اثر کردار پر ہونا ہی تھا
آگ تھی گھر میں دھواں دیوار پر ہونا ہی تھا

آستینیں کیوں چڑھالیں آپ لوگوں نے، اگر
تبصرہ پیرایۂ اظہار پر ہونا ہی تھا

یہ جہنّم زار بھی رکھتا ہے اِک ٹھنڈی سڑک
یوں دِکھاوے کا کرم نادار پر ہونا ہی تھا

جیتنے کا کچھ نہیں اظہارِ حق کے واسطے
اِک مقدمہ قافلہ سالار پر ہونا ہی تھا

لفظ لا کے بعد کُل ابواب ہیں اثبات کے
منحصر اقرار کو انکار پر ہونا ہی تھا

آدم وگندم کا رشتہ جب ازل سے ہے تو پھر
ختم ہر اِک راستہ بازار پر ہونا ہی تھا

فرق کچھ پڑتا نہیں ہے شہرِ بے حس کو مگر
سر صداقت کا کسی تلوار پر ہونا ہی تھا

میرؔ کیا غالبؔ بھی تھے دیوار کے سائے تلے
تھے وظیفہ خوار تو دربار پر ہونا ہی تھا

تاجِ سر بنکر جئے کہلائے افسرؔ شہر میں
پھر تو اپنا خاتمہ پندار پر ہونا ہی تھا

نومبر ۲۰۰۰ء

یاد یوں آتا ہے منظر رات کا
چاند کی کشتی ، سمندر رات کا

چلتے چلتے روز تھک جاتا ہے دن
روز لگ جاتا ہے بستر رات کا

سُونا سُونا سا لگے روئے سحر
جاگا جاگا سا تھا منظر رات کا

بند ہوجائے گی اب دن کی دُکاں
اور کُھل جائے گا دفتر رات کا

اتنے اُجلے دن گزرے اور پھر
دل سے کیوں نکلا نہیں ڈر رات کا

آسماں اتنا بھی کچھ چھوٹا نہیں
جتنا دِکھلاتا ہے منظر رات کا

دیکھنے پایا نہیں اب تک بھی دن
کون سے بستی میں ہے گھر رات کا

اس اُجالے پر نہ جاؤ دوستو
دن میں حصّہ ہے برابر رات کا

جو تھکے ماندوں کو دیتی ہے اماں
دن سے ہے کردار بہتر رات کا

اس اندھیرے راستہ پر صرف مَیں
اور سنّاٹا تھا افسر رات کا

جنوری ۲۰۰۱ء

الفاظ میں اشعار کی زنجیر سا کچھ ہو
اسلوبِ سخن میر تقی میرؔ سا کچھ ہو

اے چشمِ تصور دلِ پُر شوق کے آگے
تصویر نہیں ہے تو بھی تصویر سا کچھ ہو

تقدیر میں ہونا ہے تو کیا بیٹھ رہیں ہم
جاری ہے اگر سانس تو تدبیر سا کچھ ہو

پڑھنے کو کتابیں نہیں چہرے ہی بہت ہیں
کب ہم کو ضروری ہے کہ تحریر سا کچھ ہو

جنّت کو بھی دوزخ میں بدل دیتا ہے انساں
بہتر ہے کہ دنیا میں نہ کشمیر سا کچھ ہو

اُلجھاؤ ہے کافی دلِ بے تاب کو افسرؔ
زنجیر نہ ہو زُلفِ گرہ گیر سا کچھ ہو

۹ر اگست ۲۰۰۱ء

خوش قدوں، خوش رُخوں، خوش جمالوں کے نام
حسن و خوبی سے لو حسن والوں کے نام

کُل اندھیرا ہمارے لئے چھوڑ دو
اور لکھو روشنی خوش خیالوں کے نام

کم سے کم سوچ ہی سانس لیتی رہے
اس لئے رکھ دئے آنے والوں کے نام

جب بھی فرصت تو ہو اور فرحت نہ ہو
بیٹھ کر سوچنا خوش خصالوں کے نام

ہاں یہ تیرہ شبی ہے ہمارے لئے
آنے والی سحر آنے والوں کے نام

۱۰/ اپریل ۲۰۰۲ء

تُو جاگتا ہے تو یہ محوِ کار ہوتا ہے
ترا نصیب ترے ساتھ ساتھ سوتا ہے

فریبِ پاکئ کردار اس کو دینا ہے
اسی لئے تو وہ پرچھائیوں کو دھوتا ہے

تمام وسعتِ کونین اس نگاہ میں ہے
مگر یہ دل ہے کہ رو رو کے جان کھوتا ہے

وہ اپنی مصلحتیں آپ ہی سمجھتا ہے
کسی کی ناؤ وہ یونہی نہیں ڈبوتا ہے

دلیل اقراء ہے افسرؔ اور اپنا دعویٰ ہے
کہ ایک لفظ بھی اِک داستاں سموتا ہے

۱۲/۱/اپریل ۲۰۰۲ء

اگر جائز نہ ہوتیں یادگاریں
تو دجلہ میں نہ بہہ جاتیں مزاریں

رگِ جاں سے بھی ہے نزدیک تر وہ
تو پھر اس کے سوا کس کو پکاریں

شفق آلود چہرہ جھانکتا ہے
ذرا سا شام کا آنچل سنواریں

دعاؤں پر گزارا چل رہا ہے
گزرتی زندگی کو کیا گذاریں

مزے لُوٹے ہیں لُو کے زندگی بھر
چکھی تھیں صبح کچھ ہلکی پھواریں

وہاں کی زندگی ہی زندگی ہے
یہاں تو بس گزرتے دن گزاریں

بگڑ جائے گی ورنہ بات افسرؔ
سدھاریں اس سے پہلے کچھ سُدھاریں

۲۴ر جون ۲۰۰۲ء

سیاست کیوں کہیں ذہنی خلل ہے
مشرّف جنگ سے ہونا اٹل ہے

ادب دنیا میں مرتا جا رہا ہے
ہمارے آج میں بس کل ہی کل ہے

گلاب اچھا ہے کانٹوں میں بھی رہکر
کِھلا کیچڑ میں ہے تو کیا کنول ہے

تعجب ہے کہ پستی جا رہی ہے
اگرچہ اقل میں کثرت کا بَل ہے

جہاں کل تھے وہیں پائے گئے ہم
کریں کیا شہر ہی اپنا اچل ہے

۲۸ر جون ۲۰۰۲ء

ناکامیوں کا ڈر نہیں رہتا فراز پر
پرواز کے لئے ذرا کرلو دراز پَر

ظالم ہے وہ تو ظلم سے کیا باز آئے گا
ہاں رُخ بدل دیا ہے مرے احتراز پر

تہہ خانے کو گھروں کی چھتوں سے دِکھائے گا
تو جانتا نہیں ہے کہ رکھتا ہے راز پر

باندھے رکھے ہیں ہاتھ مرے اس خیال نے
رکھ دے نہ کوئی کچھ مرے دستِ دراز پر

پڑتا مجھے نہ آج بہانے تراشنا
تکیہ نہ کرتا کاش دلِ حیلہ ساز پر

جون ۲۰۰۲ء

الفاظ و بیاں میں سناٹا اور خامشی گویا اپنے میں
سُن سُن کر چیخیں راتوں کی میں دن بھر رویا اپنے میں

اِک رنگِ حنا اِک رنگِ غزل اِک عمر گزرنے پر آئے
یہ جان کے اپنا سارا ہنر خود ہم نے سمویا اپنے میں

لگتا ہی نہیں قلاش ہیں ہم لگتا ہے یہی خوش باش ہیں ہم
دراصل مگر اِک لاش ہیں ہم جو کچھ بھی تھا کھویا اپنے میں

یوں ذہن نہ تم محبوس کرو معلوم کو تو محسوس کرو
وہ نور تہہِ فانوس کرو قدرت نے جو بویا اپنے میں

یکم رجنوری ۲۰۰۳ء

ریا نے دکھایا سرابوں کا میلا
ثوابوں کے پیچھے عذابوں کا میلا

ٹِکاتے ہی سر کھُل گئیں اپنی آنکھیں
تھا تکیئے کے نیچے ہی خوابوں کا میلا

تھے خفت میں کیوں شانتی کے پجاری
لگا تھا جو خانہ خرابوں کا میلا

ہے مقتل کتابوں کا ردّی کی دُوکان
ہے آنکھوں کی جنّت کتابوں کا میلا

اکیلا ہی کافی ہے وہ کرگسوں کو
کہیں تم نے دیکھا عقابوں کا میلا

ذرا دیر ہے کچھ، ہے کچھ بھی نہیں پھر
انا کی نمائش حبابوں کا میلا

چلن چل پڑا ہے لگاتے ہیں افسر
سرنامۂ خود خطابوں کا میلا

۷ / جنوری ۲۰۰۳ء

روترش، زباں تلخ، قدم چُست، قبا تنگ
کرتے ہیں زمانے کو یہ انداز و ادا تنگ

اس کارگہہِ شوق میں آرام کسے ہے
جو عیش میں بیٹھے ہیں وہ ہیں اور سوا تنگ

اس پر بھی تو آپے میں نہیں رہتا ہے انساں
قدرت نے خود اس جامۂ ہستی کو رکھا تنگ

طاقت ہے نہ فرصت جو کریں سیرِ گلستاں
کرتی ہے ہمیں کس لئے آ جا کے ہَوا تنگ

رہتے ہیں کھُلے سب کیلئے اس کے خزانے
کرتا نہیں اللہ کبھی دستِ سخا تنگ

فراخی و وسعت تو وہاں جا کے ملے گی
لگتی ہے یہاں سے تو بہت راہِ ہدیٰ تنگ

گردن پہ تمھاری ہے جو خوں خلقِ خدا کا
کرتا نہیں کیا تم کو ذرا خوفِ خدا تنگ

موڑا نہیں منہ فرض سے کھائے ہیں طمانچے
زنہار ہَوا سے نہ ہُوا بادِ نما تنگ

افسرؔ ہے روایات سے ثابت یہ حقیقت
کھُلتا ہے بہت ذہن جو ہوتی ہے گپھا تنگ

۱۱ر جنوری ۲۰۰۳ء

ہراساں ہیں بہت ہیجان میں ہیں
ہمارے کُل عمل میزان میں ہیں

سبھی کی ناؤ غوطے کھا رہی ہے
سفینے آج سب طوفان میں ہیں

ہماری منفعت ہم جانتے تھے
مگر پھر بھی بہت نقصان میں ہیں

نکل جائے جو دَم تو جان چھوٹے
بہت ارماں نکلتی جان میں ہیں

دھڑلّے سے وبائیں بِک رہی ہیں
کہ سوداگر نئے، میدان میں ہیں

فساد و فتنہ جزوِ زندگی ہیں
صحیفے آج کل جزدان میں ہیں

ملیں گے روز یونہی کِھل کِھلا کر
کہ اصلی پھول کب گلدان میں ہیں

ترے بندے انھیں جھٹلا رہے ہیں
جو احساں سورۂ رحمٰن میں ہیں

مَیں تارے توڑ لایا لوگ افسرؔ
فَعَل اور فَعُل کی گردان میں ہیں

۲۰ رجنوری ۲۰۰۳ء

سُکھ چین کہاں سے پاؤ گے تم لوگ ہماری آنکھوں میں
دن سارا کٹا سورج کے تلے اور رات گذاری آنکھوں میں

مدّت ہوئی چھوڑے اپنا وطن لیکن نہیں چھوڑا کوئی چلن
دامن میں رہی خوشبوئے چمن اور بادِ بہاری آنکھوں میں

کب جان فسانہ بن جائے ، کب جسم کہانی کہلائے
اِک بار سہی جھانکو تو کبھی ، اِن آس کی ماری آنکھوں میں

اشعار ہمارے گونجیں گے افکار ہمارے لَو دیں گے
تم دیکھنا ہم رکھ جائینگے جو خواب تمھاری آنکھوں میں

وہ چاندنی راتوں جیسا سکوں' کلیوں کے تبسّم سا افسوں
ہے جھیل کے جیسی خاموشی' کاجل سے سنواری آنکھوں میں

کیا تم کو ملیں اطراف میں ہم، رہتے ہیں جو کوہ قاف میں ہم
ہونٹوں پہ کہانی صدیوں کی خوابوں کی پٹاری آنکھوں میں

حاصل سے ہوس مرتی ہی نہیں جھولی یہ کبھی بھرتی ہی نہیں
کچھ مانگتے رہنے کی خواہش رہتی ہے بھکاری آنکھوں میں

کہنے کو تو ہے بن باس لیا' سادھو نے کہاں سنیاس لیا
کیلاش کی باتیں ہونٹوں پر اور کنیا کماری آنکھوں میں

۲۲ر جنوری ۲۰۰۳ء

مَیں کیوں لے کر چلا تھا گھر سے آنکھیں؟
لپٹ کر رہ گئیں منظر سے آنکھیں

نہ جانے کب گزر جائے قیامت!
مَیں جھپکاتا نہیں اس ڈر سے آنکھیں

وہ کیا دیکھے جہاں کے دیکھنے کو!
جسے دیکھا کریں اندر سے آنکھیں

کہاں یہ رات کاٹوں سوچتا ہوں
چُرا کر آ گیا بستر سے آنکھیں

لحاف اوڑھے ہوئے سردی نہ آئی
لگی ہیں در پہ اکتوبر سے آنکھیں

اجازت عاجزی دیتی جو افسرؔ!
مِلاتے ہم اسی تیور سے آنکھیں

۱۵ر دسمبر ۲۰۰۳ء

یہ غزل جس دن کہی گئی اسی دن مردان علی خاں نشاطؔ صاحب کی وفات ہوئی تھی
اتفاق سے ۲۶/مارچ میرا یومِ ولادت بھی ہے۔

نہ آدم ہے نہ آدم زاد کوئی
نہیں اس دشت میں آباد کوئی

ذرا ماضی کی گٹھری پھر ٹٹولیں
نکالیں پھر پرانی یاد کوئی

ہیں محتاجِ مقدّر محنت و زر
وہ ہو فرہاد یا شدّاد کوئی

ہماری جاں بکھرتی جا رہی ہے
نہیں سُنتا مگر فریاد کوئی

جڑیں ہوتی ہیں پیوستِ رگِ دل
یونہی آتا نہیں ہے یاد کوئی

رُلا دے پھر ہمیں اشعار پڑھ کر
جو ہو صاحب علی شہزاد کوئی

ہَوا سے ہل گئی زنجیر افسرؔ
کہ ہے اِستاد پھر اُفتاد کوئی

۲۶/مارچ ۲۰۰۳ء

فکر کا اِک جہان غالب تھا
ذہن پر امتحان غالب تھا

جیتنے کے تھے کھوکھلے دعوے
ہارنے کا گمان غالب تھا

کیوں رہا زیرِ سایۂ دولت
سر پہ جب آسمان غالب تھا

انس اور عقل کی کرامت سے
فیل پر فیل بان غالب تھا

جسم مکّہ میں تھا زبردستی
دل پہ ہندوستان غالب تھا

جنگ طاقت نے جیت لی لیکن
حوصلہ میری جان غالب تھا

آج پر کل کی حکمرانی ہے
کل پہ گذرا جہان غالب تھا

ہم سے افسؔر ہزار ہونگے اِک
اسد اللہ خان غالبؔ تھا

۱۹/۱/اپریل ۲۰۰۳ء

تی ہوئی آنکھوں میں جاگی تری انگڑائی
م درد کے ماروں کو پھر نیند نہیں آئی

اے حُسن ! دل آرائی ہے کارِ مسیحائی
دنیا ترے کوچے میں کیا یونہی سمٹ آئی

ہ سیرِ گلستاں کو بے وجہ نہیں نکلے
ل کر ذرا دکھلائیں پھولوں کو بھی رعنائی

جلوے تو وہ بکھرے تھے ہم آپ ہی اندھے تھے
گو آنکھ تو رکھتے تھے مدّت میں نظر آئی

یہ زینت و آرائش یہ جودت و افزائش
س گوشۂ صحرا نے تجھ سے ہی نمو پائی

تنہائی کی جویا تھی اِک بھیڑ خیالوں کی
در بند ہوئے جونہی دیوار سے در آئی

دنیا تجھے دیوانہ سمجھے تو نہ سمجھانا
کم فہموں کی بستی میں اچھّی نہیں دانائی

مَیں کچھ بھی نہیں لیکن سب کچھ ہے مرا محسن
اِک بحر کی گہرائی قطرے میں اُتر آئی

اتنی بڑی دنیا میں افسرؔ کی یہ مجبوری
ملتا نہیں چھوٹا سا اِک گوشۂ تنہائی

۱۳ مئی ۲۰۰۳ء

ہم کہ اپنی اصل کی پہنائیوں کے ساتھ ہیں
ہیں تو پستی میں مگر اونچائیوں کے ساتھ ہیں

اپنی دنیا آپ میں رکھتا ہے تنہا آدمی
بھیڑ میں رہ کر بھی ہم تنہائیوں کے ساتھ ہیں

چاہ میں ڈالا گیا بازار میں بیچا گیا
پھر بھی یوسفؑ ہیں کہ اپنے بھائیوں کے ساتھ ہیں

چھوٹتا پیچھا کہاں یادِ ملیح آباد سے
جوشؔ پاکستان میں امرائیوں کے ساتھ ہیں

بڑھتے گھٹتے قد لرزتے کانپتے ان کے وجود
ایسا لگتا ہے کہ ہم پرچھائیوں کے ساتھ ہیں

ہیں بہادر بھی ظفر بھی اور افسرؔ شاہ بھی
قید خانے میں جو کُل پسپائیوں کے ساتھ ہیں

۲؍جون ۲۰۰۳ء

بات کیا ہے جسے پیئے سے ہو
آج تم ہونٹ کیوں سِیئے سے ہو

ہم تو شیر و شکر ہوئے جائیں
بے سبب تم لئے دِیئے سے ہو

سچ یہ ہے دیر پا نہیں ہوتا
جو سکوں اور کے کئیے سے ہو

آنکھ چندھیا گئی تو کیا حاصل
روشنی ہو تو زاویئے سے ہو

گُھٹ پُٹا ہے بجھے بجھے نہ رہو
تم تو اس گھر میں اِک دیئے سے ہو

جو ہے افسرؔ زبان پر غالبؔ
تنگ کیوں کر وہ قافیئے سے ہو

۱۳/جون ۲۰۰۳ء

جہانِ فتنہ خو کی چال یہ ہے
اور اپنی کجروی کا حال یہ ہے

خدا کے فضل سے سب خیریت ہے
اب آگے واقعی احوال یہ ہے

نہ جاؤ اس وجودِ مختصر پر
بڑی تفصیل کا اجمال یہ ہے

گذشتہ سال کے وعدے بھلا دیں
ہمارا عہد اب کے سال یہ ہے

اسے عہدِ شکست و ریخت کہنا
شکستِ عزم و استقلال یہ ہے

نہ ہو یہ زیر نہ ادبار آئے
زبانِ غالبؔ و اقبالؔ یہ ہے

نہ کہنا غم تبسم لب پہ رکھنا
علاجِ رنج و اضمحلال یہ ہے

نہیں یہ بحث کیا تھے کیا رہیں گے
ہماری زندگی فی الحال یہ ہے

زمانے بھر میں رسوا ہو رہے ہیں
ہماری شامتِ اعمال یہ ہے

بھرم کھلتا نہیں افسرؔ کا ورنہ
زمانے بھر کا اِک کنگال یہ ہے

۱۴/جون ۲۰۰۳ء

آنسو مری آنکھوں میں ترے غم کے دِیے ہیں
گویا شبِ ظلمت میں اُجالا سا کئے ہیں

زینے سے اترتی ہے ابھی صبح درخشاں
ہم شام کی دہلیز پہ دم لب پہ لئے ہیں

برسات کی آمد میں ہیں آورد کے تیور
موسم کے مزاج ہم نے ہی تبدیل کئے ہیں

ہے مصلحت اللہ کی اللہ ہی جانے
کس واسطے دریاؤں کو طوفان دئے ہیں

۱۷ رجولائی ۲۰۰۳ء

(ق)

یابس و رطب سب غزل میں ہے
جب نہیں تھا سواب غزل میں ہے

تنگ دامن تھا دورِ غالبؔ میں
آج وسعت عجب غزل میں ہے

صرف معشوق سے نہیں باتیں
بلکہ سارا ادب غزل میں ہے

برہنہ سچ ہے تلخ لہجے میں
حسنِ ابہام کب غزل میں ہے

لب کشائی میں احتیاط افسرؔ
آبروئے ادب غزل میں ہے

۱۸ر جولائی ۲۰۰۳ء

مَیں تھا اور بے حجاب تھا وہ بھی
جب کُھلی آنکھ خواب تھا وہ بھی

ظلمتِ شب اسے چھپا نہ سکی
آخرش آفتاب تھا وہ بھی

وسوسے، فکر، درد، غم سب تھے
کیا کہا ! اضطراب تھا وہ بھی

خوب تھا وہ چھپا گیا خود کو
آپ سمجھے خراب تھا وہ بھی

خود میں جو انقلاب لا نہ سکا
شاعرِ انقلاب تھا وہ بھی

۱۶/جولائی ۲۰۰۳ء

وارفتگی میں اپنا نشاں بھی نہیں اُٹھا
یوں راکھ ہم ہوئے کہ دھواں بھی نہیں اُٹھا

غارت گروں نے شہر ہی تاراج کر دیے
ہم سے شکستِ دل کا گماں بھی نہیں اُٹھا

اے صبحِ نو فضول رہا تیرا انتظار
تجھ سے تو خفتگی کا نشاں بھی نہیں اُٹھا

برباد یُوں ہوئے کہ اُڑی تک نہ راکھ بھی
یوں بجھ گیا دیا کہ دھواں بھی نہیں اُٹھا

ہم اُٹھ گئے جہاں سے کہ ہم سا کوئی اُٹھے
سُنتے ہیں کوئی بعد ازاں بھی نہیں اُٹھا

۲۹/اگست ۲۰۰۳ء

نکل گئے کئی ارماں تسلیاں کم ہیں
کہ آشیاں تو ہزاروں ہیں بجلیاں کم ہیں

جو تیرتا تو سمندر بھی پار کر لیتا
مَیں کیا کروں ! مرے بازو میں مچھلیاں کم ہیں

ہے ایک ناخنِ فن گرہ کھولنے کو بہت
انگوٹھیوں کے لئے دس بھی انگلیاں کم ہیں

نگاہِ جلوہ طلب سیر ہی نہیں ہوتی
بہت ہیں آئینہ خانے تجلّیاں کم ہیں

کہیں سے چاند ہی نکلے کہ راستہ سوجھے
سیاہ خانے میں ویسے بھی بتّیاں کم ہیں

ستمبر ۲۰۰۳ء

ہم اضطرار میں ذکرِ خدا ہی کرتے ہیں
پُرانے گھاؤ برس بھر دُکھا ہی کرتے ہیں

غبار اپنی طرف سے تو بیٹھ جاتا ہے
مگر ادھر سے بگولے اُٹھا ہی کرتے ہیں

غلط نہیں لگا کرتا ہے عشوہ و انداز
بجا کہ ناز و ادا دل رُبا ہی کرتے ہیں

یہ سوچ کر چلے ہوتے تو غم نہیں ہوتا
کہ راستے میں مسافر لُٹا ہی کرتے ہیں

نوادرات کی دُھن ہو یا ہو دفینے کی
کسی بہانے یہ کھنڈر کھدا ہی کرتے ہیں

۱۹ر جنوری ۲۰۰۴ء

سوال ہی نہیں اُٹھتا ہے آزمانے کا
بھروسہ ہم نے کیا ہی کہاں زمانے کا

ابھی سے آنکھ میں آنسو امنڈتے آتے ہیں
میاں ! ابھی تو بس آغاز ہے فسانے کا

دوام ادب میں دواوین سے نہیں ملتا
بس ایک شعر ہی کہہ لے کوئی ٹھکانے کا

انھیں سے شعر و ادب کی ہے آبرو باقی
جنھیں نہ شوق ہو نام و نمود پانے کا

چلو ! مزارِ مصوّر تو دیکھ لیں افسرؔ
ہُنر رکھے ہے وہ مقطع میں گُل کھلانے کا

(حضرت مصوّر کارنجوی)

۲۳ر فروری ۲۰۰۴ء

وثیقہ دارِ خوش حالی نہیں دِل
کسی دَم درد سے خالی نہیں دِل

چراغوں جگنوؤں کی روشنی ہے
یہ رات ایسی بھی کچھ کالی نہیں دِل

خمیدہ پشت لرزیدہ سراپا
سبب اس کا کہن سالی ؟ نہیں ! دِل

نظامِ وقت سے کیوں شورؔ دبتا
غلامِ سِکّۂ حالی نہیں دِل

بھلا اُتنا نہیں ، ہم مانتے ہیں
بُرا اِتنا جناب عالی نہیں دِل

خرابی کو جو خوبی میں بدل دے
یہ دنیا ایسی دِل والی نہیں دِل

لہو دوڑائے رَگ رَگ میں مسلسل
ذرا بھی کام سے خالی نہیں دِل

یہاں ہے زخم ذلت زہر زنداں
کسی منجم کی خوش فالی نہیں دِل

کہیں یہ آگ بھی اُگلے ہے افسرؔ
فقط زیتون کی ڈالی نہیں دِل

''حالی'' حیدرآباد کی سرکاری کرنسی کو کہا جاتا تھا۔ منظور حسین شورؔ حیدرآباد میں نظام سرکار کے عتاب کا شکار ہوئے تھے

۵/مارچ ۲۰۰۴ء

عمر جب آلام کا چارا ہوئی
واپسی جنّت میں دوبارا ہوئی

دستخط بھی جب مصوّر کے مِٹے
تب کہیں تصویر شہہ پارا ہوئی

کیا جوانی لوٹ کر آجائے گی
کیوں طبیعت انجمن آرا ہوئی

خستگیٔ عمر کا کیا ہو حساب
اِک مہینے میں تو سی پارا ہوئی

ذرّہ ذرّہ قرض خواہوں کو گیا
جمع پونجی یونہی پوبارا ہوئی

۱۰رمئی ۲۰۰۴ء

اِک سند وصفِ افتخار کے نام
اِک غزل صبر کے قرار کے نام

تشنگی آخر و رضا اولیٰ
ہے یہ خط جبر و اختیار کے نام

صبر ایقاں شعور عزم ثبات
ہیں کئی اور اس شعار کے نام

آبلہ پائی کی جزا کیا ہو!
باغِ رضوان اس بہار کے نام

ہونٹ پر پیاس ہو سوال نہ ہو
سو خوشی ایک اضطرار کے نام

رودِ کوثر ہے دیدۂ تر کو
جنتیں ہیں دلِ فگار کے نام

گل خدائی ہے صبر والوں کی
گل بڑائی ہے کردگار کے نام

۱۴ رمئی ۲۰۰۴ء

دیر تک بستر میں تڑپاتی ہے نیند
جانے کس جھونکے میں آجاتی ہے نیند

روٹیوں کے خواب دِکھلاتی ہے نیند
درد کے ماروں کو بہلاتی ہے نیند

صبح کے سورج سے شرماتی ہے نیند
منھ اندھیرے ہی چلی جاتی ہے نیند

بوڑھی آنکھوں سے ذرا کترائے ہے
ننھی آنکھوں میں سہج آتی ہے نیند

مخملیں بستر پہ کیوں آتی نہیں ؟
اور کیوں کانٹوں پہ آجاتی ہے نیند

دھوپ کی حدّت سے گھبرائی ہوئی
رات کی آغوش میں آتی ہے نیند

رات وہ اس آنکھ میں ٹھیری نہیں
سُرخ ڈورے سے یہ لکھ جاتی ہے نیند

تنگدستوں پر بہت ہی مہرباں
اور اہلِ زر کو ترساتی ہے نیند

روک رکھتی ہے گنہ سے اس لئے
بندگی کا مرتبہ پاتی ہے نیند

جیسے دنیا ہی سمٹ جاتی ہے پھر
رات بھر جب پاؤں پھیلاتی ہے نیند

مختصر سا اِک تعارف موت کا
دینے آتی ہے چلی جاتی ہے نیند

۶ر جنوری ۲۰۰۵ء

آج تک پھیلی ہوئی ہے اپنے رُخ پر چاندنی
مدتیں گزریں ، گئی تھی گدگدا کر چاندنی

چاند کو پانے کی خواہش اپنا مقصد ہی نہیں
اپنا مرکز نور ہے اور اپنا محور چاندنی

دھوپ میں تپتے ہوئے دن کے کبھی تو دِن پھریں
میرے مولا کل کے سورج کو عطا کر چاندنی

بجلیاں رہ رہ کے چمکیں ہم بھی روئے بار بار
رات کی برسات میں یاد آئی اکثر چاندنی

سر پہ سایہ ہو تو کلفت میں بھی راحت سی مِلے
دھوپ تن کو یوں لگے گویا سراسر چاندنی

کون دیکھے حسن اس کا کون دیکھے اس کی چھب
شہر کی گلیوں میں لگتی ہے گداگر چاندنی

دوسری دنیا اندھیرے گھر (دل) کی صورت دیکھتی
ہم جو سورج کو بٹھا لیتے بچھا کر چاندنی

شہر قریہ قصبہ و دیہات سے تھک ہار کر
ریگِ صحرا پر لگا لیتی ہے بستر چاندنی

۲۲؍جولائی ۲۰۰۵ء

جو چھوڑ گیا آئے گا نہیں بیٹھو نہ کسی کے رستے میں
یہ موڑ ہمیشہ آتا ہے اِک روز سبھی کے رستے میں

تھے پیڑ یا چھاؤں کے ڈیرے تھے پھول یا خوشبو کے پھیرے
سب کچھ تھا مہیّا اس نے کہا اس خاک ملی کے رستے میں

خواہش جو نہیں تھی اچھے تھے کیا چین کی نیندیں سوتے تھے
سَو وار چلے سَو گھاؤ لگے اس ایک خوشی کے رستے میں

راضی نہ رہے اور روٹھ گئے جو عہد کئے تھے ٹوٹ گئے
کچھ چھوڑ گئے کچھ چھوٹ گئے سب یار کبھی کے رستے میں

وہ سوچ میں بھی آجائیں اگر کرجائیں اُجالا آٹھ پہر
کیا چاند سے چہرے تھے افسرؔ، کل اپنی گلی کے رستے میں

۲۲/جولائی ۲۰۰۵ء

ہم ہیں فکرِ لطیف کے شاعر
قافیہ اور ردیف کے شاعر

ابر برسے تو ان کی فصل اُگے
اُف ! ربیع و خریف کے شاعر

کیا کہیں شورِ گھن گرج میں بھلا
ہم صدائے نحیف کے شاعر

ہیں دِلاور فگارؔ سے کتنے
اس بدایوں شریف کے شاعر

بزم کو بد مزہ بنا دینگے
یہ کلامِ کثیف کے شاعر

قافیہ ہم سے تنگ رہتا ہے
ہم جو ٹھیرے ردیف کے شاعر

۲۰۰۵ء

خود بتاتے ہوئے پہچان بہت سے نکلے
شہر میں اہلِ بیابان بہت سے نکلے

وسعتِ قلب دلِ سنگدلاں میں پائی
کوہساروں پہ بھی میدان بہت سے نکلے

تم مِرے شہر کی مٹی کو سمجھتے کیا ہو؟
اس خرابے سے بھی خاقان بہت سے نکلے

جس کی توہین سرِ راہ مَیں کر آیا ہوں
مجھ پہ اس شخص کے احسان بہت سے نکلے

راج جنگل کا چلا فرق مگر اتنا تھا
شہر میں امن کے فرمان بہت سے نکلے

آن کی بات پہ دیکھا نہیں آگا پیچھا
ہاں مری قوم میں زیدان بہت سے نکلے

تجھ کو چلنا ہی نہیں تھا یہ الگ بات ہوئی
راستے مجھ سے مری جان بہت سے نکلے

کم کا غم کر کے خوشی کون اکارت کرتا
جو بھی نکلے مرے ارمان بہت سے نکلے

دل نہ بہلے تو الگ بات ہے ورنہ افسرؔ
گھر میں بھی چین کے سامان بہت سے نکلے

۲۷ر فروری ۲۰۱۰ء

سب پرندے اُڑ گئے سُونا ہے منظر شام کا
ہے یہ خالی پن یہ تنہائی مقدر شام کا

رات کی ظلمت کا ڈر ہے اور سناٹے کا خوف
دن کے رہتے پھیلتا جاتا ہے شہپر شام کا

آدمی پستا ہے اس چکّی میں دو پاٹوں کے بیچ
اِک چکر صبح کا ہے ایک چکّر شام کا

عارضِ گلگوں ، شفق آلود زلفیں منتشر
ہم ان آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں منظر شام کا

رات خود نادار ہے خیرات کیا دے گی بھلا
چاند کا کاسہ لئے نکلا گداگر شام کا

۲۰۰۹ء

جھٹ پٹے کا وقت ہے چھائی ہے شام
دن کی بستی میں اُتر آئی ہے شام

وہ شفق کے رنگ اُس نے کیا کئے
کون سے کاجل سے کجلائی ہے شام

جھلملاتے سے نگینے ٹانک کر
رات کی کالی عبا لائی ہے شام

ہم نے سارا دن گزارا تھک گئے
کیا کریں اب تازہ دَم آئی ہے شام

دھوپ میں مُرجھا گئی تھی زندگی
زندگی کو رنگ میں لائی ہے شام

شہر کی اوچھی فضا بھی خوب ہے
قمقموں میں کیا نکھر آئی ہے شام

دن تو اس دن سے ذرا بھایا نہیں
ذہن پر جس دن سے لہرائی ہے شام

۱۷ رمارچ ۲۰۱۰ء

ہم کس سے کہیں جا کے سب آزار ہمارے
اب شہر میں رہتے ہی نہیں یار ہمارے
بدحال سے کیا پوچھتے ہو حال کا احوال
ماضی میں لگا کرتے تھے دربار ہمارے
ہر صبح نیا گھاؤ تھا ہر شام تڑپنا
تا عمر مہکتے رہے گلزار ہمارے
ہم عاجز و مجبور نہیں نام کے قابل
پاؤ گے کہاں شہر میں آثار ہمارے
شہرت سے غرور اپنی طبیعت میں نہ آئے
اس واسطے چھپتے نہیں اخبار ہمارے
موسم نہیں ہوتا ہے تو کہتے ہی نہیں ہم
رکھتی ہے صبا خامۂ خودکار ہمارے
اشجار کھڑے رہتے ہیں الفاظ سمیٹے
بجلی سے چمک جاتے ہیں اشعار ہمارے
دشمن بھی تو رکھتے ہیں ذرا ہم سے علاقہ
احباب نے دیکھے کہاں آثار ہمارے
کردیتے ہیں وہ بات رقم دل پہ جو اُترے
ہم خود بھی سمجھتے نہیں اشعار ہمارے
یہ اس کا کرم ہے کہ رکھا اس نے چھپا کر
ہم پر بھی نہیں کھلتے ہیں اسرار ہمارے

۱۴را کتوبر ۲۰۰۹ء

اس نے خود ہاتھ سے دریاؤں کو غم بانٹے ہیں
جن کی گہرائی ذرا کم تھی تو کم بانٹے ہیں

اہلِ دل کو تو عطا دیدۂ خوں بار کیا
اہلِ کشکول میں دینار و درہم بانٹے ہیں

اس نے بخشی ہے پہاڑوں کو یہ دوشیزہ اُٹھان
اور راہوں کو کسی زلف کے خم بانٹے ہیں

تک چڑھوں پر ہی چڑھائے گئے خوشیوں کے غلاف
خوش مزاجوں میں ہی دُکھ درد و الم بانٹے ہیں

عشق کو دربدری دے کے دئے دُرّہ و دار
عقل کو دولت و دستار و علم بانٹے ہیں

دشتِ بے درد کو دریاؤں سے سیراب کیا
درد مندوں کو مگر دیدۂ نم بانٹے ہیں

کوہِ بے فیض پہ ہے لشکرِ باراں کا ہجوم
کشتِ فیاض کو قطراتِ کرم بانٹے ہیں

۱۳ر نومبر ۲۰۰۹ء

مری پلک پہ لرزتا سا جو ستارہ تھا
تری نظر کے لئے ہی اُسے اُتارا تھا

کسی کی شام سے روشن ہُوا ہے دن میرا
حنائی ہاتھ نے سورج مجھے گزارا تھا

کڑی تھی دھوپ مگر دل کھِلا کھِلا سا رہا
کہ برگِ گل سے لبوں نے مجھے پکارا تھا

کسی کی آنکھ میں چمکا بس ایک پل کیلئے
مَیں آسمان سے ٹوٹا ہُوا ستارا تھا

نگاہ بھر کے مجھے دیکھ لو کہ اس نے مجھے
اُدھار کہہ کے ہی تم میں مجھے اُتارا تھا

وہ فکرِ دام میں ایسا پھنسا کہ ہِل نہ سکا
کہ جس کے دام میں آنا مجھے گوارا تھا

خدا نے خوش رکھا افسرؔ تمام عمر مجھے
وہ مَیں کہ شکر بھی کرنا کہاں گوارا تھا

۱۴/۱۰/اکتوبر ۲۰۰۹ء

تم نے گر دیکھے نہیں دل کے نگینے ٹوٹتے
دیکھ لو برسات میں یہ آبگینے ٹوٹتے

تیری اس پرسوں کو برسوں ہم سمجھ لیتے اگر
کیوں ترے اس کل کے وعدے پر مہینے ٹوٹتے

سرد خانوں میں وہ حدت اور جذبہ اب کہاں
پھوٹتے رُخ پر پسینے اور نگینے ٹوٹتے

اونچی اونچی پگڑیاں روندی گئیں پیروں تلے
اونچے کنگوروں کو دیکھا اس گلی نے ٹوٹتے

عہدِ نو خود ساتھ لاتا ہے نئے طور و طریق
وقت کی ٹھوکر سے ہیں سارے قرینے ٹوٹتے

پیٹ کی یہ آگ کر دیتی ہے انساں کو ذلیل
نان کے ٹکڑوں پہ دیکھے شہ نشینے ٹوٹتے

۲۲ر ستمبر ۲۰۱۰ء

دھوپ کو اوڑھ کے سو جاتا ہے سونے والا
ایک تھپکی کو ترستا ہے بچھونے والا

زورِ بازو ہو تو تقدیر بدل سکتی ہے
چاہنے سے یہاں کچھ بھی نہیں ہونے والا

خوں رُلا دیتی ہے محرومیٔ بچپن مجھ کو
جب بھی آواز لگاتا ہے کھلونے والا

مفلسی ساتھ ہے تیرے تو بڑی دولت ہے
اس جوئے خانے میں تُو کچھ نہیں کھونے والا

میری اشکوں سے گھُلا نیند کے جادو کا خمار
تیری چیخوں سے نہ جاگا کوئی سونے والا

سنہ ۲۰۱۰ء

وہ نیکوں سے بدوں میں آ گیا ہے
سمجھتا ہے قدوں میں آ گیا ہے

زمیں کیا چاہتی ہے اور اس سے
فلک اس کی حدوں میں آ گیا ہے

تعجب ہے کہ سامانِ تعیّش
ضرورت کی مدوں میں آ گیا ہے

تکلّف ترس کھانے کا نہ کیجے
تحمل غمزدوں میں آ گیا ہے

نظر میں پھر رہا ہے ایک چہرہ
کہ دشمن سرحدوں میں آ گیا ہے

لگی ہیں پائے چوبیں کی دکانیں
تو بونا بھی قدوں میں آ گیا ہے

کہاں اب تم جنوں کو ڈھونڈتے ہو
وہ اب دانش کدوں میں آ گیا ہے

اسے معلوم کیا اس کا تبسم
تکلّم کی حدوں میں آ گیا ہے

لڑکپن ہے ابھی امرائیوں میں
بڑھاپا برگدوں میں آ گیا ہے

سنہ ۲۰۱۰ء

(جلاوطن ایم۔ایف۔حسین کے یومِ وفات پر)

ہم چلے جائینگے اِک دن وہ نشانی دے کر
ہم کو بھیجا ہے جو دنیا میں کہانی دے کر

جس کا گھر چھین کے بدنام ہُوا شہر وہ آج
ننگے پاؤں گیا رنگوں کو جوانی دے کر

لوگ خوش گوش کہاں تھے کہ سماعت کرتے
وہ بھی ناخوش رہا لفظوں کو معانی دے کر

عمر بھر سب نے ٹٹولا مگر عقدہ نہ کھُلا
وہ بہت خوش ہُوا اندھوں کو نشانی دے کر

اوک پھیلائے کھڑے رہ گئے سارے پیاسے
سب کو وہ بھول گیا پیڑ کو پانی دے کر

یوں ہُوا آنکھ سے اوجھل ہو چھلاوہ جیسے
وقت ٹھیرا ہی نہیں ہم کو جوانی دے کر

کیسا ایثار و قناعت ہے بتاؤ افسرؔ
لوگ پیاسے رہیں تالاب کو پانی دے کر

۱۰؍جون ۲۰۱۱ء

قیام دشت میں ہے اور چمن کو دیکھتے ہیں
وطن سے دور سوادِ وطن کو دیکھتے ہیں

جہاں بھی لوگ مناتے ہیں اپنی جیت کا جشن
تو ہم بھی بیٹھ کے زخمِ کہن کو دیکھتے ہیں

ہمارے ہاتھ میں شمشیر تھی تو اچھا تھا
اب آج قید میں دارِ محن کو دیکھتے ہیں

جمالِ طائرِ خوش رنگ جس نگاہ میں ہے
اسی نگاہ سے زاغ و زغن کو دیکھتے ہیں

ہم ایسے لوگ کبھی مضطرب نہیں ہوتے
بڑے سکون سے سیلِ فتن کو دیکھتے ہیں

کھلے گا اگلے زمانے میں کوئی گُل افسرؔ
دَبا کے خاک میں اپنے جتن کو دیکھتے ہیں

۲۶؍جون ۲۰۱۱ء

قیام دشت میں ہے اور چمن کو دیکھتے ہیں
وطن سے دور سوادِ وطن کو دیکھتے ہیں

جہاں بھی لوگ مناتے ہیں اپنی جیت کا جشن
تو ہم بھی بیٹھ کے زخمِ کہن کو دیکھتے ہیں

ہمارے ہاتھ میں شمشیر تھی تو اچھا تھا
اب آج قید میں دارِ محن کو دیکھتے ہیں

جمالِ طائرِ خوش رنگ جس نگاہ میں ہے
اسی نگاہ سے زاغ و زغن کو دیکھتے ہیں

ہم ایسے لوگ کبھی مضطرب نہیں ہوتے
بڑے سکون سے سیلِ فتن کو دیکھتے ہیں

کھلے گا اگلے زمانے میں کوئی گل افسرؔ
دبا کے خاک میں اپنے جتن کو دیکھتے ہیں

۲۶؍جون ۲۰۱۱ء

گرم رکھتے ہے ابھی تک بھی رُخِ یار کی آنچ
وہ دہکتی ہوئی صورت لب و رُخسار کی آنچ

پیٹ کی آگ ہی کیا کم تھی جلانے کے لئے
گھر کے گھر راکھ کئے دیتی ہے بازار کی آنچ

پہلے آتی تھی صبا لیکے گلوں کی خوشبو
اب تو صحرا کو جلا دیتی ہے گلزار کی آنچ

گرم جوشی کے بھُلاوے میں اگر آ بھی گئے
ٹھیرنے ہی نہیں دیگی کسی دیوار کی آنچ

وقت سے بھی نہ بجھی ہے یہ وہ آتش غالب
روح کو آج بھی گرمائے ہے اشعار کی آنچ

شہر جل جاتے ہیں اس آنچ میں دھیمے دھیمے
اور محسوس نہیں ہوتی ہے اخبار کی آنچ

یہ جو احساس ہے دوری کو مٹا دیتا ہے
ہم کو اِس پار لگا کرتی ہے اُس پار کی آنچ

۵/اکتوبر ۲۰۱۱ء

ہے جو بگڑا نظام برسوں کا
ہے سدھرنا بھی کام برسوں کا

دے گیا عین وقت پر دھوکا
وقت جو تھا غلام برسوں کا

جہل نے پل میں خاک کر ڈالا
تھا ہُنر کا یہ کام برسوں کا

تم نے لمحات کی جو قدر نہ کی
کھو دیا احترام برسوں کا

ہیں گرانے کو چند لمحے بہت
اور بنانا ہے کام برسوں کا

چند لمحوں میں ہو گیا سب کچھ
رہ گیا اہتمام برسوں کا

کل یا پرسوں کا اعتبار نہیں
اور باقی ہے کام برسوں کا

پشت افسر زمین سے ہے لگی
آؤ ! لو انتقام برسوں کا

۲۵/اکتوبر ۲۰۱۱ء

ہمارے ذہن میں اس سوچ کا گزر بھی نہیں
کہ اپنے شہر میں اپنا تو کوئی گھر بھی نہیں

گزرتی کیا وہاں اس کی تو کچھ خبر بھی نہیں
تمھاری راہ گذر سے مرا گزر بھی نہیں

ہر ایک ماہ مجھے یہ خیال آتا ہے
کئی برس سے مجھے چاند کی خبر بھی نہیں

یہاں پہ عقل سے سب کاروبار چلتے ہیں
ہمارے شہر میں دیوانگی کا ڈر بھی نہیں

وہ رہگزر جو گزرتی ہے خیر سے ہو کر
تمھارے شہر سے اس راہ کا گزر بھی نہیں

کئی برس ہوئے سورج نگل گیا ہے کوئی
بہت دِنوں سے ہمیں دِن کی کچھ خبر بھی نہیں

۲۲/اکتوبر ۲۰۱۱ء

نہ آفتاب نہ ماہِ تمام پیدا کر
جو ہو سکے تو خود اپنا مقام پیدا کر

چلا ہے حالتِ دنیا سنوارنے کے لئے
خود اپنے گھر میں تو اس کا نظام پیدا کر

جو تجھ سے ہو سکے ہو کر دِکھا ابوالسلطاں
نہیں ضرور کہ ابنِ غلام پیدا کر

کسی مسیح کی آمد کا انتظار نہ کر
خود اپنے کعبۂ دل کا امام پیدا کر

تو اپنے گزرے ہوئے دن سے روشنی لیکر
چمکتی شام اُجالوں کے نام پیدا کر

نہ کر شکایتِ دنیا کہ شرک ہے یہ بھی
جو صید ہو سکے دنیا وہ دام پیدا کر

نہ لوٹ کر کبھی آئیگا ڈوبتا سورج
تو اس کو دیکھ کے فکر دوام پیدا کر

۲۵/اکتوبر ۲۰۱۱ء

جہاں میں جیتے ہیں ہم بھی مگر حیات سے دور
کہ کائنات میں رہتے ہیں کائنات سے دور

ہے تم کو پھر بھی توقع نجات پانے کی
یہ راستے تو چلے ہیں رہِ نجات سے دور

تعلقات نے یکجا تو کر دیا ہے مگر
مَیں تیرے ساتھ ہی رہتا ہوں تیری ذات سے دور

کسی بھی رشتے کا بندھن جکڑ سکے نہ تمھیں
معاملات سے گزرو تعلقات سے دور

کچھ ایسے آگ بجھاؤ کہ تم پہ آنچ نہ آئے
تفکّرات سے نمٹو تفکّرات سے دور

زمانہ لاکھ تصنّع سے پیش آئے مگر
تم اپنے آپ کو رکھنا تکلّفات سے دور

یوں سب کی فکر میں کھوئے کہ خود کی سُدھ نہ رہی
ہیں سب کے دن سے قریں اور اپنی رات سے دور

یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہوئی افسرؔ
حیات ختم ہوئی مقصدِ حیات سے دور

۳۱/ اکتوبر ۲۰۱۱ء

تمام عمر کسے آئی ہے شراب کی یاد
سراپا بن کے کھڑی تھی ترے شباب کی یاد

ابھی تک آتی ہے اس عہدِ ذی شراب کی یاد
ہماری عشق کی رندی ترے شباب کی یاد

کہاں کی نیند کہاں کا سکون کیسا قرار
لگا رہی تھی کچوکے ترے عذاب کی یاد

بدلتے دور نے کس کس سے کردیا محروم
جو خط کھُلے تو کھِلے موسمِ گلاب کی یاد

حقیقتوں کا کبھی تم نے سامنا نہ کیا
سجائے رکھتے ہو ہر دَم خیال وخواب کی یاد

خدا کا خاص کرم ہے یہ خود فراموشی
خدا کسی کو نہ دے اس قدر عذاب کی یاد

تواضع ہم کو بچھائے نہ کیوں رکھے افسرؔ
کہ خاک ہی تو دِلاتی ہے بوتراب کی یاد

۴؍نومبر ۲۰۱۱ء

سمٹ کے رہ گئی جینے کی ہر لگن مجھ میں
کہاں گیا وہ جو دریا تھا موجزن مجھ میں

کھُلا کھُلا سا رہا مجھ میں اِک دریچہ سا
کھِلا کھِلا سا رہا یاد کا چمن مجھ میں

وہ سرد لہر چلی تھی کہ پھر چلا نہ گیا
ابھی ابھرنے نہ پایا تھا بانکپن مجھ میں

نہیں ہے آس ، تو پھر انتظار کس کا ہے ؟
نہیں ہے پھانس، تو باقی ہے کیوں چبھن مجھ میں

کھُلا کہ ترکِ تعلق سے کچھ نہیں ہوتا
چھُپی ہوئی ہے ترے دید کی لگن مجھ میں

مری پسند سے میں سانس لے نہیں سکتا
چھُپا ہُوا کوئی غالب ہے غالباً مجھ میں

مَیں اس خیال سے رہ رہ کے کانپ جاتا ہوں
پنپ رہا ہے کوئی دورِ پُر فتن مجھ میں

۵ / نومبر ۲۰۱۱ء

چلیں جو سنگ وہ لائق ہمارے سر کے تو ہوں
وہ تیرے گھر کے نہ ہوں تیری راہ پر کے تو ہوں

یہ کیا کہ یونہی اُٹھیں اور روبرو ہوجائیں
ترے حضور میں حاضر ذرا سنور کے تو ہوں

ذرا سی دیر جلیں ٹمٹما کے رہ جائیں
چراغِ شام جلے ہیں یہ رات بھر کے تو ہوں

ترے کرم کے بھکاری ہیں بس کرم چاہیں
جو خاص کر کے نہیں ہوں سو عام کر کے تو ہوں

نہ یوں کہ ساتھ چلیں دو قدم بچھڑ جائیں
رفیقِ راہِ سفر ہوں تو اِک سفر کے تو ہوں

مَیں مر گیا مری گمنامیوں کے ساتھ افسرؔ
نہیں ہوئے مرے چرچے، مرے ہنر کے تو ہوں

۶؍نومبر ۲۰۱۱ء

دل کی تہوں میں ایک بھی آنسو نہ چھوڑتے
اتنا تو گریہ کرتے کہ دامن نچوڑتے

ہوتی سمجھ جو سختیٔ حالات کی ہمیں
پتھر کے دل کو نوکِ قلم سے نہ توڑتے

ہوتا جو اختیار ہمارے سفر پہ کچھ
ہم اس بھری بہار میں گلشن نہ چھوڑتے

ہوتا سوادِ گل کا ذرا بھی ہمیں دماغ
ہم ایسے خارزار سے رشتہ نہ جوڑتے

آتا ہے یہ خیال دیارِ غریب میں
ہوتا گرہ میں مال تو ہم گھر نہ چھوڑتے

۸/نومبر ۲۰۱۱ء

دشت سے چل کے آئیں بستی میں
اور دیکھیں بلائیں بستی میں

پھر رہی ہیں بلائیں بستی میں
گھر سے باہر نہ جائیں بستی میں

تجھ کو جنگل بھی بس نہیں تھا ہوا
پھر یہاں سائیں سائیں بستی میں

اس لئے ہو رہی ہے خوں ریزی
امن کی ہوں فضائیں بستی میں

جن کو انسانیت سے پیار نہ ہو
لوگ ایسے نہ آئیں بستی میں

پہلے بیماریاں کریں پیدا
اور بیچیں دوائیں بستی میں

رہتے ہیں دور دور سب افسر
کس سے قربت بڑھائیں بستی میں

۱۱ر نومبر ۲۰۱۱ء

اِک دِیا سا جلائے رکھتے ہیں
ہم اندھیرا بجھائے رکھتے ہیں

درد کب ساتھ میں نہیں ہوتا
ہاں اسے ہم بھلائے رکھتے ہیں

اپنا ہمدرد جن کو سمجھے ہو
سنگ دل کی بجائے رکھتے ہیں

پھوٹی کوڑی نہ جیب میں ہو مگر
اپنا سکّہ جمائے رکھتے ہیں

کام آئے اڑے بھڑے افسر
ہم تبسم بچائے رکھتے ہیں

۱۱ر نومبر ۲۰۱۱ء

صبر و قرار ہم کو زمانے کا دے دیا
دنیا کو اختیار ستانے کا دے دیا

دریا کی موج کو دیا طغیانیوں کا زور
اور ہم کو شوق تیر کے جانے کا دے دیا

پیدا کئے اسی نے مصائب نئے نئے
اور غم بھی مجھ کو سارے زمانے کا دے دیا

نہلا یا میرے جسم کو میرے ہی خون سے
اوروں کو کام اشک بہانے کا دے دیا

زندہ دِلوں کے سارے جواہر لُٹا دئے
مردہ دِلوں کو خبط خزانے کا دے دیا

مَیں تھا مرے خیال میں تنہا تمام عمر
تمغہ مجھی کو بزم سجانے کا دے دیا

مَیں نے جو عاشقی کے تقاضے کئے قبول
تب اس نے حکم سر نہ اُٹھانے کا دے دیا

پہلے نگاہ کو دیا آوارگی کا شوق
اور ذہن میں خیال ٹھکانے کا دے دیا

پانی کو پہلے کر دیا تالاب میں اسیر
منصب ہَوا کو آگ بجھانے کا دے دیا

پانا نہ پانا ذوقِ طلب پر ہے منحصر
نقشہ تو اس نے اپنے خزانے کا دے دیا

رسماً جو ہم نے پوچھ لیا آپ کا مزاج
گویا کہ اِک خیال بہانے کا دے دیا

بیٹھے تھے لوگ کان پہ صافہ لپیٹ کر
اور اس نے حکم شعر سُنانے کا دے دیا

۲ر دسمبر ۲۰۱۱ء

شام آئی ہے تو بس رات ہے ہونے والی
اب نہیں کوئی کرامات ہے ہونے والی

آخری ایک نظر دیکھ لیں جاتے جاتے
اب کہاں تم سے ملاقات ہے ہونے والی

دل دھڑک اُٹھتا ہے رہ رہ کے جو پتّے جیسا
ایسا لگتا ہے کوئی بات ہے ہونے والی

ہم نے ہی جان پہ آفات کے طوفاں جھیلے
ہم سے ہی پرسشِ حالات ہے ہونے والی

ڈبڈباتے ہوئے بادل سے فضا بھیگی ہے
ایسا لگتا ہے کہ برسات ہے ہونے والی

کون ہے ہونی کو جو روک لے بڑھ کر افسرؔ
ہو کے رہتی ہے کہ جو بات ہے ہونے والی

نومبر ۲۰۱۱ء

نظر میں ایک ہی پیکر نگاہ دنیا پر
یوں ہم نے بند نہ کی کوئی راہ دنیا پر

جو کارِ خیر ہوئے وہ تو خیر ہم نے کئے
گناہ جو ہوئے اس کا گناہ دنیا پر

کہ رہ کے دنیا میں دنیا کو چھوڑنا کیسا
نگاہ ڈالتا رہ گاہ گاہ دنیا پر

یہ اور بات کہ اظہار ہم نہیں کرتے
دُلار آتا تو ہے بے پناہ دنیا پر

ہے دیکھنا جو ضروری تو دیکھ لیتے ہیں
کہ ڈالتے نہیں دل سے نگاہ دنیا پر

جسے بھی دیکھئے دنیا کا حاشیہ بردار
کسے بنائیں ہم اپنا گواہ دنیا پر

جو اہلِ زر ہیں وہ پاسنگ میں نہیں آتے
گراں ہے وزن میں اِک کج کلاہ دنیا پر

کوئی نقیب نہ حاجب نہ پاسدار کوئی
کھُلی ہوئی ہے تری بارگاہ دنیا پر

ہم اپنے دیدۂ حیرت کو کیا کریں افسرؔ
ہیں پاؤں قبر میں لٹکے نگاہ دنیا پر

جنوری ۲۰۱۲ء

کشیدگی کی ہیں راتیں تناؤ کے دن ہیں
کہ عمر ختم ہوئی چل چلاؤ کے دن ہیں

جو ملنے آؤ تو مِل لو کہ پھر مِلیں نہ مِلیں
سرھانے قبر کے کچھ ہی پڑاؤ کے دن ہیں

اے ننھی کونپلو ! آؤ تمھیں بتاؤں مَیں
وہ کل جو آئے گا اس کے بناؤ کے دن ہیں

ابھی سے ذہن کو شہہ دو کہ وہ اُڑان بھرے
یہی تو ذہنِ رسا کے اُٹھاؤ کے دن ہیں

ابھی سے جوشِ نمو کو اُبھارنا ہوگا
زمینِ جذب یہی تو رَچاؤ کے دن ہیں

تنے جو خوب نشانہ بھی بے خطا ہوگا
یہ زندگی کی کماں کے کساؤ کے دن ہیں

ابھی سے کیوں ہے تمھیں فکر مرہم و درماں
ابھی تو تیر کے خنجر کے گھاؤ کے دن ہیں

طبیب کرتا ہے افسرؔ پرہیز کی باتیں
یہی تو قورمہ ، زردہ ، پلاؤ کے دن ہیں

جنوری ۲۰۱۲ء

اپنے گھر میں کب سکوں کی سانس لے پایا تھا مَیں
تھا مِرے سائے کا دشمن جس کا ہمسایہ تھا مَیں

تھم گئی شمشیرِ شب تو دِن کا نیزہ چل گیا
جنگ کے میدان جیسی زندگی لایا تھا مَیں

صبح بگلوں کی قطاریں ، شام چیلوں کا جماؤ
کن اداکاروں کی بستی میں نکل آیا تھا مَیں

چاند نکلا ہی نہ تھا تارے تھے بادل میں چھپے
دن میاں! تم تھے کہاں؟ جب رات گھبرایا تھا مَیں

خندہ روئی گرم جوشی مجھ میں کیا ملتی تمھیں
تم ملے اس وقت جب خود کو بجھا آیا تھا مَیں

تم چمن زاروں میں تھے محلوں میں بازاروں میں تھے
یاد بن کر دور تک راہوں میں لہرایا تھا مَیں

میرؔ و سوداؔ ذوقؔ و غالبؔ حالیؔ و اقبالؔ و فیضؔ
کارواں کی دھول سا پیچھے چلا آیا تھا مَیں

۱۳/مارچ ۲۰۱۲ء

اپنے گاؤں میں ذرا بھی جو اُجالا ہوتا
ہم نے اس شہر میں ڈیرا نہیں ڈالا ہوتا

آنکھ کی عید الگ ، پیٹ کا کہرام جُدا
مجھ کو اس کرب سے اِک دن تو نکالا ہوتا

ناؤ دریا میں جو ڈالی چلو اِک بھول ہوئی
اُس نے طوفاں کو تو دریا میں نہ ڈالا ہوتا

تم کو ہوتا جو ذرا چاندنی راتوں کا شعور
تم نے روٹی کی جگہ چاند نکالا ہوتا

آج اوروں کو وہ سائے کا ذریعہ بنتی
تم نے دیوار پہ سایہ کبھی ڈالا ہوتا

تم اُترتی ہوئی سیڑھی پہ کھڑے تھے افسرؔ
دھیان اپنا ذرا گہرائی میں ڈالا ہوتا

۲۳/مارچ ۲۰۱۲ء

جشن کی جو بزم تھی وہ مجلسِ ماتم ہوئی
صبح کی اُجلی کرن کیوں شام میں مدغم ہوئی

کوئی تو ٹھنڈی پھواریں کھا کے پھر سے کِھل اُٹھا
اور کسی کے واسطے برسات بے موسم ہُوئی

اجنبی دن کے لئے پردوں پہ پردے ڈالئے
رات سے کیسے چھپانا رات تو محرم ہوئی

آرہا تھا گھر کی ہر دیوار سے نالوں کا شور
ہجر کے مارے تھے سب کیا مجلسِ ماتم ہوئی

قید سے آزاد ہو کر اِک پرندہ اُڑ گیا
دھیرے دھیرے، دھیرے دھیرے نبضِ جاں مدھم ہوئی

۲۶ / مارچ ۲۰۱۲ء

دل میں لگ جائے تیر کے جیسی
اب غزل کیا ہو میرؔ کے جیسی

ان کی نخوت میں شاہ کے تیور
اپنی حالت فقیر کے جیسی

موت ' سیلاب ' زلزلہ ' آندھی
زندگی اِک لکیر کے جیسی

کلفتِ راہِ دوست اپنے لئے
راحتِ دل پذیر کے جیسی

ہے اجازت چلوں پھروں لیکن
حیثیت ہو اسیر کے جیسی

مرتبے میں غلام ہے لیکن!
حصّہ داری امیر کے جیسی

موت آکر ٹلا نہیں کرتی !
ساعتِ نا گزیر کے جیسی

۲۷/مارچ ۲۰۱۲ء

ہَوا کی خوب جب چھنتی ہے ہم سے
یوں آندھی کی ہَوا بنتی ہم سے

چمن کا حال ہم بھی جانتے ہیں!
صبا کیوں اس قدر تنتی ہے ہم سے

بگڑتے ہیں بنائے کام اپنے
زمانے کی نہیں بنتی ہے ہم سے

ہماری عاجزی میں مست ہیں ہم
ہوا کس موج میں تنتی ہے ہم سے

ہے صاحب سے یونہی صاحب سلامت
بہت گاڑھی نہیں چھنتی ہے ہم سے

ہے افسر دل نشیں اپنی کہانی
مگر کہتے نہیں بنتی ہے ہم سے

۱۳/اپریل ۲۰۱۲ء

سعیٔ ارض کو عالم میں پیچ و تاب مِلا
نہ آفتاب ہی پایا نہ ماہتاب مِلا

نشاط و عیش کی کوشش میں اِک عذاب مِلا
سکون درد میں ڈھونڈا تو بے حساب مِلا

جوان رہنے کی خواہش کبھی نہ بوڑھی ہوئی
سفید کرنوں میں ہر شام کو خضاب مِلا

ہزار سجدے کئے سر جہاں ذرا بھی اُٹھا
عتاب ہوگیا ، مردود کا خطاب مِلا

۲۰/اپریل ۲۰۱۳ء

مرے گھر چاندنی اُتری ہوئی ہے — مگر صورت بری اُتری ہوئی ہے
گھروں میں مالداری کی ہے رونق — رگوں میں مفلسی اُتری ہوئی ہے
مَیں کاغذ پر اسے کیسے اُتاروں — جو دِل میں اِک چھبی اُتری ہوئی ہے
صفِ ماتم بچھی ہے جس جگہ پر — وہیں بارات بھی اُتری ہوئی ہے
قبا سے جھانکتی ہے ایک اُنگلی — کرن اِک چاند کی اُتری ہوئی ہے
ہمارا غم ہی ہم کو کھا رہا ہے — تو صورت کیوں تری اُتری ہوئی ہے

ق

زمیں کی ظلمتوں کو ختم کرنے — فلک سے چاندنی اُتری ہوئی ہے
اندھیرا ختم ہوتا ہی نہیں ہے — اگرچہ روشنی اُتری ہوئی ہے

ہم افسرؔ اس کا احساں کیا اُتاریں
جو ہم پر شاعری اُتری ہوئی ہے

۲۰/اپریل ۲۰۱۲ء

مرا مزاج کہ دیوار ، در کے جیسی ہو
مگر رواج کہ چوروں کے ڈر کے جیسی ہو

خزانے غیب کے وہ آنکھ دیکھ لیتی ہے
کہ بوند اوس کی جس کو گہر کے جیسی ہو

تعلق اصل سے کٹ کر مِٹا نہیں کرتا
تو کیوں نہ شاخِ شجر بھی شجر کے جیسی ہو

بنا ہی اصل میں شر کے خمیر سے ہے بشر
تو اس کے دل میں نہ کیوں آگ شر کے جیسی ہو

۲۱/اپریل ۲۰۱۳ء

پہلا سا وہ مزاج گل افشاں نہیں رہا
یعنی خیال و شوقِ بہاراں نہیں رہا

ہوتی رہیں عطا پہ عطا اس کی بخششیں
دل میں خیالِ تنگیٔ داماں نہیں رہا

گویا کہ اس نے جی ہے اپاہج کی زندگی
وہ جس کے سامنے کوئی طوفاں نہیں رہا

ہاں گردشِ حیات کو مجھ سے رہا گِلا
مَیں گردشِ حیات سے نالاں نہیں رہا

رستے کی دھوپ خون کو گرما گئی تو پھر
مَیں برف باریوں سے پریشاں نہیں رہا

اُڑتا پھرا ہُوا میں خیالوں کے دوش پر
مَیں ملتجیٔ تختِ سلیماں نہیں رہا

پھر کیوں نہ ہو اسیرِ الم ساری زندگی
جب احترامِ شامِ غریباں نہیں رہا

چھوڑا وطن تو یادِ وطن ساتھ ہی چلی
افسرؔ دیارِ غیر میں حیراں نہیں رہا

۲۵/اپریل ۲۰۱۳ء

نشانِ درد بے دردی سے دیکھا
مگر احسان ہے جلدی سے دیکھا

نہ دیکھا ہم نے پھر گرمی کی جانب
نکلتا کام جب سردی سے دیکھا

ہمارا حوصلہ ہی تھا کہ جس نے
پہاڑوں کو بھی پامردی سے دیکھا

تمھیں گھیرے رہا منصب کا گھیرا
نکل کر تم نے کب وردی سے دیکھا

بہت شاداب ہے ہمّت کی دنیا
نکل کر مُرغ نے زردی سے دیکھا

جھپٹ کر وار جب ہم پر ہُوا ہے
پلٹ کر ہم نے بھی جلدی سے دیکھا

وہ ہم ہی ہیں کہ بچپن سے ابھی تک
مصیبت کو جواں مردی سے دیکھا

۲۹؍اپریل ۲۰۱۳ء

کبھی سنائی کہاں دی ہے نغمگی میری
مری حدوں میں مقیّد ہے شاعری میری

کہ مجھ سے میرا تعارف کبھی ہُوا ہی نہیں
کبھی ہوئی ہی نہیں مجھ سے دوستی میری

مَیں جانتا تھا مگر مَیں نے اس کی فکر نہ کی
کرے گا جسم کسی روز مخبری میری

الاؤ جلتے رہے رقص میں رہی دنیا
یوں کائنات میں محفل سجی رہی میری

مَیں اپنے آپ میں جل جل کے بجھ گیا اِک دن
کبھی پڑی ہی نہیں مجھ پہ روشنی میری

کہیں سے کوئی صدا دے تو میری جان بچے
مجھی کو ختم نہ کردے یہ خامشی میری

مَیں جانتا تو یہ چادر بڑی نہیں کرتا
مجھے ہی تنگ کرے گی کشادگی میری

۸ر مئی ۲۰۱۳ء

کیسے تمھیں بتلائیں سماں اور ہی کچھ تھا
رہتے تھے جہاں ہم وہ جہاں اور ہی کچھ تھا

لے لیکے اجازت وہاں آتی تھی خزاں بھی
وہ اپنا چمن رشکِ جناں اور ہی کچھ تھا

لگتا تھا کہ بس آ گیا مٹھی میں زمانہ
تقدیر کی گٹھری میں نہاں اور ہی کچھ تھا

تم لوگ مکیں ہو تو مکاں ہی نہیں لگتا
وہ لوگ مکیں تھے تو مکاں اور ہی کچھ تھا

جب کارواں نکلا تو چلے ہم بھی تھے لیکن
چلتے ہوئے ذہنوں میں رواں اور ہی کچھ تھا

سُنتے تھے کہ مغلوب ہُوا ہم سے زمانہ
ہم دیکھنے آئے تو سماں اور ہی کچھ تھا

۲۲ رمئی ۲۰۱۳ء

توکل کی نشانی دیکھتے ہیں
جو کشتی بادبانی دیکھتے ہیں

ق

نظر ہی سے روانی دیکھتے ہیں
کہاں کتنا ہے پانی دیکھتے ہیں

مدد کوئی نہیں کرتا مگر ہم
سبھی کی مہربانی دیکھتے ہیں

تعجب ہے کہ ہم مَل مَل کے آنکھیں
وہی دنیا پُرانی دیکھتے ہیں

کسی پر کب نظر پڑتی ہے اپنی
تجھی کو یار جانی دیکھتے ہیں

پہاڑ اپنی جگہ پر سرنگوں ہیں
سرنگوں کی زبانی دیکھتے ہیں

کسی بھی آنکھ میں پانی نہیں ہے
تو خود کو پانی پانی دیکھتے ہیں

ق

گلوں کے گرد ہے کانٹوں کا پہرا
خدا کی نگہبانی دیکھتے ہیں

جہاں تک بھی نظر جاتی ہے افسرؔ
ہم اس کی مہربانی دیکھتے ہیں

۲۵رمئی ۲۰۱۲ء

آج کی دہشت زدہ دنیا کا انساں بے سپر
رات دن تیروں کی بارش جنگ جاری عمر بھر

چاند گھر آتے ہیں دن ڈھلتے مگر ایسے نہیں
خاک سے آلود چہرہ جسم خوں سے تر بتر

آنکھ میں اشکوں کا دریا دل میں بے دَم ہر اُمید
زخم سارے کارگر ساری دعائیں بے اثر

آنسوؤں میں گھُل رہا ہے زندہ رہنے کا یقیں
جاں کی لاگت لگ رہی ہے آج اِک اِک سانس پر

روز جسموں کا ادھڑنا روز ذہنوں پر تناؤ
شام انگاروں کا بستر اور تڑپنا رات بھر

ایک لمحے کو کھنکتی چوڑیوں جیسی خوشی
پھیل جاتا ہے کبھی پھیکا تبسم ہونٹ پر

زندگی کھیتی ہے کل کی، آج کچھ فرصت تو دے
آبیاری چاہتا ہے ہر درختِ بے ثمر

پاؤں میں زنجیر ہوتی ہے مگر دِکھتی نہیں
بے در و دیوار زنداں، قید لیکن معتبر

۶ر جون ۲۰۱۲ء

تمھارا یہ خزانہ بھی بہت ہے
خوشی سے مسکرانا بھی بہت ہے

اگر ہو آدمی میں خوش مزاجی
ہَوا کا گدگدانا بھی بہت ہے

جما کر میرے سر پر اس نے گاگر
کہا! تجھ کو نچانا بھی بہت ہے

زمانے کی حقیقت جاننے کو
ذرا سا آزمانا بھی بہت ہے

بزرگوں کو بھلا کیا دینگے افسؔر
ادب سے پیش آنا بھی بہت ہے

۱۲ر جون ۲۰۱۲ء

چاند کی سدھ نہ چاندنی کا مزا
زندگی میں نہیں کسی کا مزا

مرسلاً پا گئے مبارک ہو
ہے رسولوں سے مفلسی کا مزا

ہم ہی کہتے ہیں ہم ہی سنتے ہیں
خود ہی لیتے ہیں خود کہی کا مزا

تم کو شاہوں کی شان کا چسکا
ہم کو خسرو کی شاعری کا مزا

تیرے تیور پہ ہے نظر اپنی
خوب ملتا ہے ان کہی کا مزا

۲۳؍جون ۲۰۱۲ء

دیکھا گیا نہ ہم سے زمیں پر جو خونِ شوق
دریا کو سونپ آئے ہیں سارے فنونِ شوق

دنیا تمھاری اور مشاغل تمھارے اور
اب تم سے کیا کہے کوئی حالِ جنونِ شوق

تم وضعدار لوگ زمیں سے نہ اُٹھ سکے
دنیا کی حد سے پار گئے ہم درونِ شوق

دیوانگی ہے دشت میں اِک مردنی کے ساتھ
دریا کی موج میں تر و تازہ جنونِ شوق

تہذیب سانس لیتی نظر آئے گی تمھیں
زندہ ہمارے فن میں رہیں گے فنونِ شوق

صدہا برس کا دَور ہماری نظر میں ہے
ہم سے نہیں ہیں دور ہمارے قرونِ شوق

زندہ ہیں اس لئے کہ قضا آئے تو چلیں
بیٹھے ہیں انتظار میں ہم سرنگونِ شوق

ہم خستہ حال پھرتے ہیں افسرؔ لئے ہوئے
دنیائے ہفت رنگ نہاں در فسونِ شوق

۱۰/جولائی ۲۰۱۲ء

صبح کے آغاز کا انجام شب
زندگی کے خاتمے کا نام شب

بے مروّت بے وفا بے‌زار دن
دل رُبا، دلدار، دل آرام شب

پُر تکلّف مہتمم بالشان دن
بے تکلّف، بے ردا، بے نام شب

رات کے آنچل میں سوجاتا ہے دن
کرنے جاتی ہے کہاں آرام شب

دن کی ساری جگمگاہٹ بجھ گئی
خوب چمکیں رات بھر مادام شب

دن کبھی آیا نہ اس کے دام میں
دن کے ہاتھوں بک گئی بے دام شب

داغ تو رکھتی ہے دن کی بھی قبا
ہوگئی ہے مُفت میں بدنام شب

زخمیوں کو چھوڑ کر دِن تو گیا
رات بھر سُنتی رہے کہرام شب

تمغۂ غیضِ پدر دِن کو مِلا
مامتا کا لے گئی انعام شب

دن کو نگرانی کی فرصت ہی کہاں
دیکھتی رہتی ہے میرے کام شب

دن تو دفنا کر مجھے چلتا بنا
خوب روئی لیکے میرا نام شب

۱۱ر جولائی ۲۰۱۲ء

ہاں کیا مَیں نے، کہا میری خودی نے جیسا
حال میرا رہا طوفاں میں سفینے جیسا

کیا ضرورت اسے آرائش و زیبائش کی
جس کے ماتھے پہ پسینہ ہو نگینے جیسا

کاٹتا رہتا ہے شہہ رگ بڑے آرام کے ساتھ
کوئی دشمن نہیں انسان کا کینے جیسا

دفن ہونے کو تھے ہم رنج و الم کے ہاتھوں
بس اچانک مِلا اِک دوست خزینے جیسا

لوگ کہتے ہیں کہ جینا نہیں آیا ہم کو
ہم سمجھتے ہیں کہ ہم جی لئے جینے جیسا

کوئی مشکل نہیں آئی نہ چڑھاؤ نہ گھماؤ
تھا سفر اپنا اُترتے ہوئے زینے جیسا

اس کی مرضی سے جیئو تم تو کوئی بات بھی ہے
جی سے جینا بھی کوئی جینا ہے جینے جیسا

کام آئے گی اڑے وقت یہ دولت افسرؔ
درد کو دِل میں دبا رکھنا دفینے جیسا

۱۴ر ستمبر ۲۰۱۲ء

طاق پر رکھ کر یہ اپنی فاقہ مستی ایک دن
دیکھنے نکلیں گے ہم بھی دل کی بستی ایک دن

راستے سونے پڑے تھے بند تھے بازار بھی
رات جب جاگی ہوئی تھی اپنی ہستی ایک دن

دن گذرتے دیر کب لگتی ہے شیشے نے کہا
ڈھونڈتے رہ جاؤ گے یہ اپنی ہستی ایک دن

جس نے دیکھا حالِ افسر پوچھنے بیٹھا مزاج
غالباً غالب ہوئی تھی پیش دستی ایک دن

۱۷ ستمبر ۲۰۱۲ء

خامشی ہے اب دلِ بے تاب میں
اب دِیے جلتے نہیں محراب میں

دھوپ اس کا سارا پانی پی گئی
ایک صحرا ہے دلِ دُریاب میں

عہدِ رفتہ حال میں موجود ہے
مَیں ہی تھا گزرے ہوؤں کے خواب میں

ہے سکوں کی اِک دعا میرا سلام
ہائے شامل ہے ترے آداب میں

اِک ذرا پتوار سے چوکی نظر
اور کشتی پھنس گئی گرداب میں

جس نے پتھّر دل کو پانی کردیا
کچھ تو تھا اس دیدۂ پُر آب میں

داستان میں وہ ورق ملتے نہیں
اعترافِ جرم تھا جس باب میں

میں جو ڈوبا ہوں تو پھر اُبھرا نہیں
اور بھی تالاب تھے تالاب میں

اب نہیں کرتا کوئی ہم کو قبول
کل بہت مقبول تھے احباب میں

کیسی تھی تقسیم پانی کٹ گیا
پانچ دریا اب نہیں پنجاب میں

ہوں مصوّر ہم تو دِکھلائیں تمھیں
وہ جو منظر ہے، ہمارے خواب میں

۱۹ر ستمبر ۲۰۱۲ء

کل جو گذری وہ کہانی اور ہے
آج خبروں کی زبانی اور ہے

زخم کھا کر شہر سے نکلے ہیں ہم
راستے کی دھول کھانی اور ہے

دشمنوں نے اِک الگ سازش رچی
دوستوں نے دل میں ٹھانی اور ہے

کلفتِ عقبیٰ اُٹھانے جائے کون؟
اُلفتِ دنیائے فانی اور ہے

رنگ برنگی آج کی دنیا ہے یہ
کل کی وہ دنیا پرانی اور ہے

کل قضائے آسمانی اور تھی
آج مرگِ ناگہانی اور ہے

۲۱ر ستمبر ۲۰۱۲ء

بسا ہے ناگ ندی کے کنارے
مگر بستی سپیروں کی نہیں ہے

ہے سورج کے نہونے پر یہ ظلمت
حکومت یہ اندھیروں کی نہیں ہے

یہاں کچھ دیر دَم لو اور چل دو
یہ آبادی بسیروں کی نہیں ہے

کسی کا کھا کے کیا کرتے گزارا
کہ یہ فطرت ہی شیروں کی نہیں ہے

ذرا میں کام چل جائے گا اپنا
ضرورت ہم کو ڈھیروں کی نہیں ہے

کہیں سے اُڑ کے آئی ہوگی افسرؔ
یہ مٹی ان کھنڈیروں کی نہیں ہے

۲/ اکتوبر ۲۰۱۲ء

یادِ یاراں! تجھے ہم کب ہیں بھلانے والے　　ہم تو ہر روز ہیں اِک عرس منانے والے

بیٹھے رہتے ہیں اکیلے ہی خیالات میں گم　　آتے رہتے ہیں ملاقات کو آنے والے

آب پاشی کی ضرورت نہیں اِن پودوں کو　　ہیں چٹانوں میں بھی یہ پھول کھِلانے والے

رتجگوں میں یوں کٹی عمر کہ ہم سے اکثر　　آنکھ مَلتے ہوئے مِلتے ہیں جگانے والے

ہم کو ہر اجنبی لگتا ہے خود اپنے جیسا　　ہم کو کیوں غیر سمجھتے ہیں زمانے والے

برسرِ راہ کہیں ملتے ہیں، چلتے چلتے　　گھر تک آتے نہیں اب اپنے گھرانے والے

تنگ حالات میں ہم کھل کے ملا کرتے ہیں　　ہم سے کب کھُل کے ملیں گے یہ زمانے والے

روز سُنتے ہیں صدا نیند سے بہتر ہے نماز　　ہم تو سوتے ہی نہیں ہیں اے جگانے والے

راستے بند ہیں معلوم ہے اس کو پھر بھی　　گیت گاتی ہے وہ بابل کو بلانے والے

ہم نہیں بھولتے اِک پل بھی کسی کو افسرؔ
اب رُلاتے ہیں ہمیں کل کے ہنسانے والے

۳۰رنومبر ۲۰۱۲ء

آرام کی خواہش کو سُلانے کے لئے آ
آ پھر سے نیا زخم لگانے کے لئے آ

دنیا تری باتوں میں تو آنے سے رہے ہم
تو پھر بھی نئی بات بتانے کے لئے آ

بے دام بِکے تھے سو وہیں ہم تو پڑے ہیں
آ صید بنالے یا اُڑانے کے لئے آ

بےخواب سی راتیں بڑی بےکیف ہے یاراں
تو پھر سے نئے خواب سجانے کے لئے آ

رونے کیلئے تیرا نہ آنا ہی بہت ہے
اِک بار کبھی ہنسنے ہنسانے کے لئے آ

۳ر دسمبر ۲۰۱۲ء

آغاز دِکھاتا ہے انجام کا منظر تک
قطرے سے محبّت ہے پہنچو گے سمندر تک

اوروں کی طرف دیکھا اور خود سے نظر چوکی
تو حال کے شیشے میں بس اپنا ہی پیکر تک

دنیا میں سبھی پیاسے، لب تر ہوں کہ سوکھے ہوں
بس ایک ہی نقشہ ہے صحرا سے سمندر تک

عینک ہے وہاں جیسی ویسا نظر آتا ہے
خبریں تو پہنچتی ہیں سرکار کے دفتر تک

باہر سے سبھی اُجلے، بگلے کے پَروں جیسے
اندر سے سیہ پیکر عوام سے افسر تک

۲۶؍جنوری ۲۰۱۳ء

آ گیا کیا وقت کے قابو میں دِل
اب دھڑکتا ہی نہیں پہلو میں دِل

آج تک مہکی ہوئی ہے بزمِ جاں
رکھ دیا تھا پھول نے خوشبو میں دِل

دِل کی خواہش تھی کہ اُڑتا ہی پھرے
ذہن کہتا تھا رہے قابو میں دِل

جب نہیں ہے موت کا کوئی علاج
ہم نہیں رکھتے دَوا دارو میں دِل

چوکڑی بھرتا ہُوا نکلا تو تھا
کھو گیا شائد رمِ آہو میں دِل

آہ افسؔر اس لئے بھرتا نہیں
خود ہی دھڑکے ہے اگر بازو میں دِل

۲۹ رجنوری ۲۰۱۳ء

قافیوں کے چراغ روشن ہیں
اے غزل! تیرے باغ روشن ہیں

میرؔ کی شمع ہے بجھے گی نہیں
بعد غالبؔ کے داؔغ روشن ہیں

سلسلہ نور کا تھمے گا نہیں!
اِک بجھا سَو چراغ روشن ہیں

ظلمتوں سے مزاحمت کے لئے
دل نہیں تو دماغ روشن ہیں

طاق پر جب نظر گئی تو کھُلا
بجھ گئی شمع داغ روشن ہیں

صبح نو! تیرے خیر مقدم کو!
شام ہی سے چراغ روشن ہیں

زر کی پروا ذرا نہیں کرتے
علم سے جو دماغ روشن ہیں

اس طرف سے جو کچھ اُجالا ہے
میکشوں کے ایاغ روشن ہیں

جو مکاں برق نے جلا ڈالے
وہ شبِ بے چراغ روشن ہیں

عالموں کا کتاب پر تکیہ
عارفوں کے دماغ روشن ہیں

تھا جو بے چہرہ عمر بھر افسرؔ
اس کے چشم و چراغ روشن ہیں

۲۵ / جون ۲۰۱۳ء

سخت ایذا ہے تنِ زار کو دینے والا
رنگ و روغن در و دیوار کو دینے والا

مانگ لیتا ہوں دعا دے تو بھلا ہو میرا
حکم مَیں کون ہوں ، مُختار کو دینے والا

بھاگتے دوڑتے اس شہر میں اب کوئی نہیں
اِک تسلّی دلِ بیمار کو دینے والا

ضعف اتنا ہے ہلا بھی نہیں جاتا مجھ سے
مَیں ہی رفتار تھا رفتار کو دینے والا

تم ضرورت کو جگاتے ہو کچھ کے دے کر
کون پیسہ ہے خریدار کو دینے والا

رحم آمیز نگاہوں سے وہ دیکھیں مجھ کو
مَیں یہ موقعہ نہیں اغیار کو دینے والا

۳رفروری ۲۰۱۳ء

رات دن کی ہیرا پھیری، رُت کی چھل موسم کی گھات
آدمی کی جیسی فطرت ویسی اس کی کائنات

ہم نئے سورج کو کہنے بھی نہ پائے مرحبا !
صبح کی پہلی کرن میں آگئی ہجرت کی رات

مال کا سُکھ، آل کا دُکھ، سال وسن کی کھینچ تان
ٹوٹتی ریشم کی ڈوری چھوٹتے ہاتھوں سے ہاتھ

ہر قدم پر مرحلوں کا سامنا کرتی ہوئی
موت سے دامن بچاتی راستہ چلتی حیات

ذہن میں سِکّوں کی گنتی، پشت پر شکموں کا بوجھ
پاؤں دلدل میں پھنسے اورعزمِ فتحِ شش جہات

ہاں ضرورت ہے ہمیں بے شک، مگر ملتا نہیں
رنج کی اس دھوپ میں چھاؤں کے جیسا سر پہ ہاتھ

ذہن میں مرتی اُمیدیں آنکھ میں خوابوں کا غم
جلتے بجھتے جگنوؤں سی آپ کے وعدے کی رات

۲۴رفروری ۲۰۱۳ء

سمندر مِل رہے ہیں چھن رہے ہیں
مگر ہم موجِ دریا گِن رہے ہیں

ہمارے حال سے لگتا نہیں کیا ؟
ہمارے بھی کئی محسن رہے ہیں

صِفر کی سمت یہ اپنا سفر ہے
سو ہم اب اُلٹی گنتی گِن رہے ہیں

اُجالے میں ہے راتوں کی کہانی
اندھیرے میں ہمارے دن رہے ہیں

یہاں رہنے کی کوئی بات بھی تھی ؟
رہا جاتا نہ تھا لیکن رہے ہیں

مَیں پیڑوں پر کلہاڑی کیا چلاؤں ؟
مِرے پرکھوں کے یہ ہم سِن رہے ہیں

زمانے کے لئے مشکل تھے افسرؔ !
تمھارے واسطے ممکن رہے ہیں

۱۰ رمئی ۲۰۱۵ء

(۱۷؍مارچ شادی کی سالگرہ پر)

تینتیس برس کی یہ رفاقت ہے بڑی چیز
یہ میری نہیں تیری بدولت ہے بڑی چیز

مفلس کے خزانے میں ندامت ہے بڑی چیز
افلاس میں مہمان کی دعوت ہے بڑی چیز

جب ہاتھ میں کچھ آئے تو ایثار ہے بہتر
جب پاس نہ ہو کچھ تو قناعت ہے بڑی چیز

نیکی میں گوارا نہیں اِک ذرّہ تکبّر
ڈھیروں ہوں گنہ صرف ندامت ہے بڑی چیز

ہم اپنی حفاظت بھلا کیا خاک کریں گے
اللہ کی جانب سے حفاظت ہے بڑی چیز

۱۷؍مارچ ۲۰۱۳ء

تگ و دو ہی میں ہم نے شام کی ہے
ہمیں عادت کہاں آرام کی ہے

لکھائی دست برداری جہاں سے
تو جنّت اس نے میرے نام کی ہے

گلوں پر مردنی چھائی ہوئی ہے
خبر شائد انھیں انجام کی ہے

چراغوں کو بجھا کر جل رہا ہوں
اندھیرے سے یہ قربت نام کی ہے

دباتا ہے مجھے بارِ تکلّف
بڑی تکلیف اس آرام کی ہے

یونہی شیشے میں آب آتی نہیں ہے
کہ صیقل میں صفائی کام کی ہے

سنوارے کیوں کسی کے کام کوئی
سبھی کو فکر اپنے کام کی ہے

ہے اس پر بوجھ ذکرِ غم بھی افسرؔ
تو پرسش بھی برائے نام کی ہے

۱۸/اگست ۲۰۱۳ء

بڑے چکّر میں لا کر چھوڑتی ہے
یہ دنیا ہے نچا کر چھوڑتی ہے

کسی سے دور کا رکھتی ہے رشتہ
کسی کو پاس لا کر چھوڑتی ہے

تو اپنے بل پہ بل کیوں کھا رہا ہے
یہ دنیا بل چھڑا کر چھوڑتی ہے

ہَوا جب لیکے اُڑتی ہے فلک پر
گھٹا کو بھی گھٹا کر چھوڑتی ہے

رفاقت میں ذرا سی ہیرا پھیری
اسے فرقت بنا کر چھوڑتی ہے

مجھے امید دروازے پہ لا کر
ہمیشہ مسکرا کر چھوڑتی ہے

مصیبت خود نہیں آتی ہے افسرؔ
کوئی شئے ساتھ لا کر چھوڑتی ہے

۲۰ / اگست ۲۰۱۳ء

وہ چُپ رہتا ہے کچھ کہتا نہیں ہے
وہ دریا ہے مگر بہتا نہیں ہے

ٹھکانہ اس کا مَیں کیسے بتاؤں
یہاں ہوتا ہے وہ رہتا نہیں ہے

یہاں کمزور ہی سہتا ہے سب کچھ
قوی جو ہے وہ کچھ سہتا نہیں ہے

پریشانی میں آجاتا ہے لیکن
پریشانی میں دل رہتا نہیں ہے

چٹانوں سا ہے اس کا صبر افسرؔ
وہ سہتا سب ہے کچھ کہتا نہیں ہے

۱۶ر نومبر ۲۰۱۳ء

دل جو ٹوٹا حباب کے جیسا
پھر نہ پھولا گلاب کے جیسا

عاجزی اور انکساری میں
کون ہے بوتراب کے جیسا

تخم ریزی کرو کہ بیٹھا ہے
وقت مٹی میں آب کے جیسا

ہے ہَوا اور ورق ورق میرا
ایک بکھری کتاب کے جیسا

اس جہنّم میں وقت کٹتا ہے
اِک مسلسل عذاب کے جیسا

اپنی دنیا سیاہ شب کی سی
ان کا رُخ ماہتاب کے جیسا

ہر قدم میرے ساتھ چلتا ہے
ہے کوئی ہمرکاب کے جیسا

سایۂ ابر بر مہہ تاباں
اِک سرکتی نقاب کے جیسا

جوشؔ محفل میں پھر نہیں آیا
شاعرِ انقلاب کے جیسا

۲۰/دسمبر ۲۰۱۳ء

گھر کا نظام بگڑا
دنیا کا کام بگڑا

دل میں بگاڑ آیا
طرزِ کلام بگڑا

دن بھر رہا وہ راضی
اب وقتِ شام بگڑا

تم کیا سدھار لوگے
آوا تمام بگڑا

بگڑے ہوئے ہو سب سے
جب ہی تو نام بگڑا

کیسا بگاڑ آیا ؟
ہر خاص و عام بگڑا

اوّل تمام عمدہ !
آخر تمام بگڑا

۱۸ / جنوری ۲۰۱۴ء

تم نے مرے خیال کو خاطر میں لا لیا
گویا بعید شے کو بھی حاضر میں لا لیا

کہنا ''نہیں'' نہ چاہو تو ایک لفظ ''لا'' کہو
سرکار نے یہ لا ہی دفاتر میں لا لیا

ہم اپنا کھیل اپنے تئیں کھیلتے رہے
اور پھر قضا نے ہم کو مقابر میں لا لیا

کرنے کے کام جو تھے پسِ پشت ڈال کر
ہر اِک ''نہی'' کو ہم نے اوامر میں لا لیا

کڑوی تھی اس کی بات مگر اس نے سچ کہا
تم نے ڈھکی چھپی کو بھی ظاہر میں لا لیا

اب خود کا پیٹ کیسے بھروں سوچتا ہوں مَیں
جو کچھ تھا میہمان کی خاطر میں لا لیا

۲۰ر جنوری ۲۰۱۴ء

الٰہی رحم ! مجھے رائیگاں نہ جانے دے
تو اِس کھنڈر سے زمانے کو کچھ خزانے دے

تو اپنی سیدھ میں میرے سفر کو جاری رکھ
ترے طرف جو بڑھائیں وہی ٹھکانے دے

مَیں تیرے قُرب کے قابل کہاں مِرے مولا !
تو اپنی سوچ کے لائق مجھے بنانے دے

تو میرے دل کو کچوکے لگا کے زندہ رکھ
تو میری فکر کو عبرت کے تازیانے دے

تو میری بھوک کو فاقے کھِلا کے زندہ رکھ
تو تشنگی کو مرا صبر آزمانے دے

ہوائے شہرتِ دنیا نہ سر میں در آئے
مرے شعور کے غنچے کو سرد خانے دے

جو تیرے شُکر میں سجدہ کروں تو سر نہ اُٹھے
کسی دعا کے لئے بھی نہ ہاتھ اُٹھانے دے

رقیق کردے تو قلبِ سعید افسؔر کو !
تو اُس کی آنکھ کو رونے کے کچھ بہانے دے

اِک معمّا آج سلجھا دوسرا آئے گا کل
آج کے پھندے سے نکلا، پھر اُلجھ جائے گا کل

پس گئے حالات کی چکّی میں سارے ولولے
پھر نئی طاقت لئے میدان میں آئے گا کل

آج جتنا سُوت کاتا وہ ہَوا میں اُڑ گیا
کل کی گٹھری کے لئے آندھی نئی لائے گا کل

لحظہ لحظہ بے بدل ہے اس سے غافل حظ اُٹھا
آج کی کُل رونقیں لیکر چلا جائے گا کل

آج تجھ سے جو مِلے اس کو خوشی دیکر ہنسا
اِک تبسّم بن کے ہونٹوں پر نظر آئے گا کل

یکم رمارچ ۲۰۱۴ء

لہو باقی رگوں میں ئے نفس زیر گلو باقی
بچا ہے بس یہ جسم زخم زار جستجو باقی

دلِ دُر باب زندہ تھا تو آنکھوں میں چمک سی تھی
نہ اب پہلی سی رنگینی ، نہ اب وہ آبِ رو باقی

گئے وہ لوگ جن کے دم سے میرا دل دھڑکتا تھا
مگر اب بھی ہے گلشن میں ذرا کچھ رنگ و بو باقی

عجب پھیکی ملاقاتیں، عجب روکھے رویئے ہیں
نہ شورِ قہقہہ باقی ، نہ شورِ ہا و ہو باقی

بچھڑ جانے کا ماتم ہے نہ اب ملنے کی بے تابی
گیا جذبِ دروں ، اِک ہے ہوائی گفتگو باقی

وطن کی یاد آتی ہے، وطن میں ہے کشش لیکن
نہیں اہلِ وطن میں دید کی وہ آرزو باقی

۲۶/ مارچ ۲۰۱۴ء

کسی کی جستجو میں پھر رہا ہوں
نمازی ہوں، وضو میں پھر رہا ہوں

لپیٹے جسم پر احرامِ ہستی
طوافِ دشتِ ہُو میں پھر رہا ہوں

سنبھالے نقشۂ باغِ تمنّا !
مَیں دشتِ بے نمو میں پھر رہا ہوں

کسی کو کچھ نہیں معلوم کب سے
جہانِ رنگ و بو میں پھر رہا ہوں

ہے رقصِ جامِ دل سینے میں جاری
مَیں بزمِ بے سبو میں پھر رہا ہوں

یہیں پر ختم کر دے میری دنیا
مَیں چشمِ روبرو میں پھر رہا ہوں

۲۳/اپریل ۲۰۱۴ء

تمھارے سر تھے رویّے تمھاری پشتوں کے
جو ٹکنے پائے نہ تم سامنے حریفوں کے

گرفت میں جو نہ آئے اُسے پکڑنا کیا ؟
ہَوا ہو، دھوپ ہو، سایہ، نشان قدموں کے

سُنا یہی ہے کہ نکتہ نواز ہے مولیٰ
ہمارے پاس بھی کیا ہے سوائے نکتوں کے

تُم اپنے زعم میں آنکھیں چُرائے بیٹھے تھے
سیاہ تختے تھے دیوار پر نوشتوں کے

جو میرا حال ہُوا بعد میں بتاؤں گا
ابھی تو گنتا ہوں اعداد مَیں شکستوں کے

یہ اور بات کہ ہم قہقہہ لگا نہ سکے
جناب ہم بھی تو شائق رہے لطیفوں کے

رئیس تو ذرا نرمی سے بات کرلے گا
مزاج ہی نہیں ملتے ہیں فاقہ مستوں کے

سیاہ خانۂ دل کی جھلک چھپاتے ہیں
سجائے رکھتے ہیں رُخ پر نشان سجدوں کے

۲۳رمئی ۲۰۱۴ء

کاش انسان کو اس بات کا ڈر ہوجائے
جانے کب شہرِ خموشاں کا سفر ہوجائے

ہم نے اپنے لئے بس ایک دعا مانگی ہے
زندگی اپنی قناعت میں بسر ہوجائے

یاد پر شکر ہو بیداد کا چرچا نہ کرو
اس وطیرے سے رہو تم تو گزر ہوجائے

تم نے رکھا ہی کہاں ایسا تعلق دل سے
دل وہاں دھڑکے یہاں دل کو خبر ہوجائے

ہم نے آنگن سے امیدوں کے شجر کاٹ دئے
آس اب کچھ نہیں باقی یہ خبر ہوجائے

آخری بار ہو اس جانِ بہاراں کا خیال
آخری سانس بھی خوشبو میں بسر ہوجائے

ہم نے اپنے لئے چاہا نہیں دنیا کا حصول
بس یہ چاہا کہ کسی طور بسر ہوجائے

۹ر جون ۲۰۱۴ء

(محبّی توفیق کے انتقال کے بعد)

تمھارے بعد یہ دنیا عجیب لگتی ہے
قضا ہمیں بھی بہت ہی قریب لگتی ہے

کہیں بھی جائیں مگر دل کہیں نہیں لگتا
ہمیں تو ساری فضا غم نصیب لگتی ہے

جدھر نگاہ پھرے تم نظر میں پھرتے ہو
وہ بُعد اور یہ قربت عجیب لگتی ہے

ہمیں نہیں ہوئی توفیق تم سے ملنے کی
خطا یہ اپنی سزا کے قریب لگتی ہے

بہت سے آسرے لگتے ہیں سانس لینے کو
دھڑکتے دل کو دوائے طبیب لگتی ہے

ہے ختم سانس کا سرمایہ، گن کے خرچ کرو
وہی کرو جو صدائے حبیب لگتی ہے

کسی سے کیا کہیں اب وقت ہی کہاں افسؔر
کہ بات رکھنے صدی کے قریب لگتی ہے

۱۶ر جولائی ۲۰۱۴ء

صوتِ بہار سُنتے		دل کی پکار سُنتے
ہوتی جو آنکھ تم کو		نقش و نگار سُنتے
دنیا بنی تھی بہری		تم تو پکار سُنتے
تھے منتظر ہمارے		گرد و غبار سُنتے
تجھ پر گذر گئی جو		ہم بھی تو یار سُنتے
اب دیدنی ہوئے ہم		پہلے پکار سُنتے
ہم سے گرے پڑوں کی		کیا ذی وقار سُنتے
آہٹ ترے قدم کی		لیل و نہار سُنتے
تاریخ بولتی ہے		صدیوں کے پار سُنتے
لاشوں کی خامشی سے		چیخ و پکار سُنتے
قول و قرار کرتے		قول و قرار سُنتے

۲۰۱۴ء

نکلے تھے اپنے گھر سے نہ آنے کے واسطے
مجبور ہو کے رہ گئے جانے کے واسطے

سُن لو ہمارے بعد نہ سُن پاؤ گے کبھی
بیٹھے نہیں رہیں گے ، سُنانے کے واسطے

اب کیا دکھائیں آپ کو ہم بدنصیب لوگ
اِک زخم رہ گیا ہے دِکھانے کے واسطے

آجا کے کوئی تیر چلاتا ہے کس لئے
اب دِل میں کیا رہا ہے دُکھانے کے واسطے

افسرؔ ترے لئے یہ زمانہ ہے دم بخود
تو خود نہیں بنا ہے زمانے کے واسطے

۳ر جون ۲۰۱۴ء

مرے یقین کے قلعوں کو منہدم کر کے
وہ چل دیا مجھے ذرّوں میں منقسم کر کے

مَیں اپنی ذات کے زنداں میں ہو گیا محبوس
خود اپنے آپ کو ملبوسِ مہتمم کر کے

لکیر مُلک نے کھینچی ، چُھری دِلوں پہ چلی
گھٹا دیئے کئی سر شہر منضم کر کے

کیا یہ حال تمدّن کے پاسداروں نے
تواب کے دیکھ لیں وحشی کو منصرم کر کے

تمام ذِلّتیں مظلوم کے نصیب میں تھیں
زمانہ خوش ہُوا ظالم کو محتشم کر کے

نگل گئی کوئی ماھی کسی کو لمحوں میں
نکل گیا کوئی دریا کو منقسم کر کے

کسی سے ظلم کا بدلہ نہیں لیا ہم نے
کوئی نہ دیکھ سکا ہم کو منتقم کر کے

۳۱ر جولائی ۲۰۱۴ء

اندھیری رات میں کب تک یہ زندگی گزرے
کبھی کبھی تو یہاں سے بھی روشنی گزرے

ہم اس لئے نہیں رکھتے ہیں رتجگوں کا حساب
کہ ایک شب جو ملے وہ ہنسی خوشی گزرے

سرھانے ہاتھ کا تکیہ لگا کے لیٹ گئے
تکلّفات سے کیوں نیند کی پری گزرے

عجیب حال ہے اپنے مزاج کا افسرؔ
لگے ہے یوں وہ یہاں سے ابھی ابھی گزرے

۲؍اگست ۲۰۱۴ء

ذرا سی دیر ہوئی تھی مجھے لگان دئے
اور اس نے خوف کے بادل فضا میں تان دئے

ہمارے سینے پہ کیوں صبر کی سپر باندھی
انھیں کے ہاتھ میں کیوں تیر اور کمان دئے

بھٹکنا اپنا مقدر ہی بن گیا گویا
نشان اُس نے دئے بھی تو بے نشان دئے

تو چشمِ آہو کو ہشیار کردیا ہوتا
شکاریوں کی حفاظت کو جب مچان دئے

ہمیں نے شامِ غریباں سے روشنی پائی
ہمیں نے شہرِ یزیداں میں امتحان دئے

نہتے رہ کے بھی ہتھیار بند کہلائے
کہ تیر اُس نے دئے بھی تو بے کمان دئے

یہ اوس ، ابر ، یہ خوشبو ، یہ برگِ گُل ، یہ ہَوا
مرے خدا نے مجھے کتنے ترجمان دئے

۱۳ر ستمبر ۲۰۱۴ء

تمام دنیا کے شہروں کو جا کے دیکھتے ہیں ہمارے شہر کو نقشہ اُٹھا کے دیکھتے ہیں

رہے سہے جو نشاں ہیں مِٹا کے دیکھتے ہیں ہم اپنی خاک سے خاکے بنا کے دیکھتے ہیں

گمانِ بحر میں کشتی چلا کے دیکھتے ہیں ہتھیلیوں پہ جزیرے بنا کے دیکھتے ہیں

ذرا سی ذہن کی اُلجھن بڑھا کے دیکھتے ہیں ہم اپنے ہاتھ کا حاصل گھٹا کے دیکھتے ہیں

تم اپنے زعم میں ڈالو نہیں نگاہ تو کیا ہمارا حال تو بندے خدا کے دیکھتے ہیں

جو سہمے سہمے سے رہتے ہیں موت کے ڈر سے وہ خواب میں بھی جنازے قضا کے دیکھتے ہیں

بچھڑنے والے کی تصویر بھی نہیں ہے تو کیا شبیہ اس کی تصور میں لا کے دیکھتے ہیں

ہماری آنکھ کو رونا مگر نہیں آتا ہزار واقعے کرب و بلا کے دیکھتے ہیں

بگاڑ کا کوئی پہلو کہیں نظر آئے بناؤ ناصحیں دیدہ جما کے دیکھتے ہیں

بہل تو جائے گا کچھ دیر کے لئے ہی سہی ہم اپنے شوق کو رستہ دِکھا کے دیکھتے ہیں

ہمیشہ جیتتے رہنا ہی اُس کو بھاتا ہے تو آؤ ہم ہی ہزیمت اٹھا کے دیکھتے ہیں

بہت ہے شوق تماشا امیر لوگوں میں وہ کھڑکیوں سے تماشا لڑا کے دیکھتے ہیں

بہت دِنوں سے نہ دیکھیں کھُلی کھُلی زلفیں صبا کو آج ذرا ورغلا کے دیکھتے ہیں

طلسم ہوش رُبا کل کی بات ہے افسرؔ
ہمارے بچّے ہمیں کو بنا کے دیکھتے ہیں

۲۹ رستمبر ۲۰۱۴ء

پاؤں رکھنے کی جگہ شہر میں ملتی ہے چلو
زندگی بخش سزا شہر میں ملتی ہے چلو

بھوک اور پیاس ہی گاؤں میں اُتاری اس نے
دینے والے کی عطا شہر میں ملتی ہے چلو

روتے روتے تو گلا رُندھ گیا ہے سب کا
بے نواؤں کو نوا شہر میں ملتی ہے چلو

تم جو دیکھو گے اُسے دیکھتے رہ جاؤ گے
زخم کی پیاری قبا شہر میں ملتی ہے چلو

سرد مہری سے یہاں خون جما جاتا ہے
گرمیٔ صوت و صدا شہر میں ملتی ہے چلو

خیر خیرات وہاں لوگ کیا کرتے ہیں
سیر چشمیٔ گدا شہر میں ملتی ہے چلو

تم نہیں پاؤ گے لوگوں کی نگاہوں میں سوال
خود حسابی کی ادا شہر میں ملتی ہے چلو

پاؤں لمبے ہوں تو چادر بھی بڑھا سکتے ہو
ہمّتِ ارض کُشا شہر میں ملتی ہے چلو

خود بخود دوڑتی ہے ہمّتِ مرداں تن میں
یعنی امدادِ خدا شہر میں ملتی ہے چلو

زندہ رہنے کی سزا گاؤں میں کاٹے نہ کٹے
زندہ رہنے کی جزا شہر میں ملتی ہے چلو

شورِ انبوہ میں یکسوئی نمک جیسی ہے
لذّتِ یادِ خدا شہر میں ملتی ہے چلو

اپنے جوہر نہ گنے، غیر کے کنکر چھانٹے
خود کو پانے کی دوا شہر میں ملتی ہے چلو

ہر قدم پر جو خدا یاد نہ آئے تو کہیں
مہلتِ ذکرِ خدا شہر میں ملتی ہے چلو

یکم اکتوبر ۲۰۱۴ء

ہم اپنی وسعتِ قلب و جگر کو دیکھتے ہیں
وہ جس نظر سے ہماری نظر کو دیکھتے ہیں

بہت مقام ہیں دنیا میں دیکھنے کیلئے
مگر ہم اپنے ہی بوسیدہ گھر کو دیکھتے ہیں

سخنوروں کو کہاں اپنی ذات پر غرّہ
وہ کم ہُنر ہیں جو دادِ ہُنر کو دیکھتے ہیں

ستائش اور صلا کی ہمیں نہیں پروا
سخن کے باب میں نقد و نظر کو دیکھتے ہیں

سفر طویل ہے سامان کچھ نہیں یکجا
وہاں کے لوگ تو رختِ سفر کو دیکھتے ہیں

ہم اپنے صبر و قناعت کے آزمانے کو
کسی کے گھر سے خود اپنے ہی گھر کو دیکھتے ہیں

یہ زخم میرے عزیزوں نے ہی دیا ہے مجھے
"یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں"

خود اپنی راہ جو پیدا کیا نہیں کرتے
وہ رہ میں بیٹھ کے خواجہ خضر کو دیکھتے ہیں

نظر اُٹھا کے کسی کو وہ دیکھتے کب ہیں
نگاہ بھر کے جو تیری نظر کو دیکھتے ہیں

پتہ یہ چلتا ہے بے خوف جی رہے ہیں ہم
کسی کے ڈر سے جب اپنے ہی ڈر کو دیکھتے ہیں

۱۳ /اکتوبر ۲۰۱۴ء

گذر، گذار جیسے الفاظ کو گزر، گزار پڑھنے کی درخواست ہے ۔ سعید اختر

نشہ کچھ اپنے ہونے کا اُتر جاتا تو اچھا تھا
وہ جھگڑا تھا مگر مَیں اس کے گھر جاتا تو اچھا تھا

نہ کچھ کہتا، نہ کچھ سُنتا، خموشی سے دبے پاؤں
اندھیری رات کے جیسا گذر جاتا تو اچھا تھا

سماعت میں نہیں آیا تو پامالی مقدر تھی
مِرا کہنا ترے دل میں اُتر جاتا تو اچھا تھا

مَیں بچپن چھوڑ آیا تھا جوانی ساتھ تھی میرے
مَیں اس پہلی ہی لغزش پر جو ڈر جاتا تو اچھا تھا

سیاہی میرے چہرے کی اُجالے میں نہ آ جائے
ابھی سورج نہیں نکلا مَیں گھر جاتا تو اچھا ہے

۱۶راکتوبر ۲۰۱۴ء

زخم دِکھلائیں تجھے یہ نہ بھَلی بات لگی ہم پلٹ آئے کہ مہندی ہے ترے ہاتھ لگی
ہم سے دیوانگیٔ شوق کا عالم مت پوچھ جو ہمارے لئے دن تھا وہ تجھے رات لگی
شور سُنتے رہے ہم گھر میں ہی بیٹھے بیٹھے گھر سے نکلے ہیں تو چوکھٹ سے تھی بارات لگی
انتظام اس نے مرے واسطے کیا کیا نہ کئے دن تپش دے کے گیا رات کو برسات لگی
جو بھی ممکن تھا کِیا پھر بھی یہ دھڑکا ہے لگا کیا اسے کوئی کمی وقتِ مدارات لگی
ایسا لگتا ہے بھلے دن کبھی آئیں گے نہیں ہاتھ چوروں کے ہے مدّت میں یہ بارات لگی
عادتاً زخم تو ہنس ہنس کے سہے ہیں ہم نے فطرتاً بوجھ مگر پرسشِ حالات لگی
بمبئیٔ تو نے پذیرائی بہت کی لیکن اپنی مٹّی ہی الگ تھی نہ ترے ہاتھ لگی
ہم سمجھتے ہیں کہ اس دام ہے ستا سودا صبح پانے کے لئے ایک سیاہ رات لگی
عمر بھر اس نے جو محنت کی کمائی کھائی اہلِ دنیا کو یہ ہرگز نہ کرامات لگی
گھاؤ تلوار کا بھر جائے گا اِک روز مگر زخم بھرنے کا نہیں دل کو اگر بات لگی

ہم نے مدّت میں کیا قاعدہ ازبر افسرؔ
جس نے دیکھا، نہ پڑھا، اس کے سند ہاتھ لگی

۱۷را کتوبر ۲۰۱۴ء

آس کو سانس کے کیا کیا نہ سہارے دیکھے
ہم نے بجھتی ہوئی آنکھوں میں ستارے دیکھے

نیند کو قید کئے رکھا ہے تم نے گھر میں
تم نے سڑکوں پہ کہاں نیند کے مارے دیکھے

جو ہَوا سے ہُوا ہلکا وہ زمیں پر نہ مِلا
چند لمحوں کو فضاؤں میں غبارے دیکھے

ایک مالی کی خوشی بھی نہ میّسر آئی
مالداروں کے بہت ہم نے خسارے دیکھے

تم نے رڈّی کی دکانوں سے اُٹھایا ہے ادب
اور پکوان مگر گرم کرارے دیکھے

تم نے نزدیک کی عینک سے کبھی کچھ نہ پڑھا
"دور کی دید" سے کیا کیا نہ نظارے دیکھے

۲۰؍اکتوبر ۲۰۱۴ء

تھی زمیں بپھری ہوئی شعلہ دہن آتش بکف
ابر کتنی دور سے آیا تھا بِن برسے گیا

خشک آنکھوں میں سفیدی کے سِوا کچھ بھی نہیں
قطرہ قطرہ کر کے دریا دیدۂ تر سے گیا

دل جو پردہ دار ہے کرتا ہے آنکھوں سے سوال
مَیں کبھی گھر سے نہ نکلا اشک کیوں گھر سے گیا؟

ایک بیٹے سے مجھے ابلیس کا آیا خیال
وہ خدا سے لڑ گیا ، یہ باپ پر برسے گیا

مَیں تھکے قدموں سے کیسے اور کہاں تک دوڑتا
مَیں جہاں تک بھی گیا ہوں ، بس مقدر سے گیا

زندگی بھر کی کہانی یوں ہے کچھ الفاظ میں
جو مقدر سے مِلا تھا وہ مقدر سے گیا

ہے فضاؤں میں یہ کیسا زہر افسر کیا پتا
جو کبوتر گل اُڑا تھا ، آج وہ پَر سے گیا

۲۴/اکتوبر ۲۰۱۴ء

لب تھے پیوست کہاں ، منھ دمِ گفتار کھُلا
یوں حریفوں کو مِلا موقعۂ اِظہار کھُلا

زنگ آلود ہے تلوار کہاں تھا معلوم ؟
یہ تو جاکر کہیں ہم پر دمِ پیکار کھُلا

دل میں دھڑکا نہ رہا گھر میں رکھا ہی کیا ہے
ہم یونہی چھوڑ کے آئے نہیں گھر بار کھُلا

لوگ حیرت سے مری خوش طبعی دیکھتے ہیں
مَیں کھُلا یوں ہوں کہ مجھ سے ہے مرا یار کھُلا

کوئی بندش نہیں ، زنجیر نہیں ، قید نہیں
وہ جو پابند ہے رہتا نہیں زنہار کھُلا

ہم پری اور پری زاد سمجھتے تھے جنھیں
سامنا جب ہُوا ان سے تو پریوار کھُلا

اس نے دیوار احاطے کی اُٹھالی افسرؔ
اس کی جانب جو دریچہ پسِ دیوار کھُلا

۲۵/اکتوبر ۲۰۱۴ء

ہم سمجھتے آ رہے تھے اپنے جیسے لوگ ہیں
اب سمجھ میں آ گیا ہے، ہائے کیسے لوگ ہیں

آن دیکھو، آن اِن کی آن میں مِل جائے گی
اس تماشا گھر میں جو ہیں ایسے ویسے لوگ ہیں

منبر و محراب کی زینت ہیں جبّہ دار لوگ
معرکوں میں کام آئیں، کب یہ ایسے لوگ ہیں

اب وہ چہرے ہی نہیں ہم دیکھ کر جن کو کہیں
ذکر ہے جن کا کتابوں میں یہ ویسے لوگ ہیں

تم ذرا نزدیک آؤ تو تمھیں محسوس ہو
پھول سی خوشبو ہے اِن میں پھول جیسے لوگ ہیں

دھول سے چہرے اَٹے ہیں پیٹ پر پتھر بندھے
آسماں کو ناز جن پر ہے یہ ویسے لوگ ہیں

وہ یہاں رہتے تو ہیں لیکن پتہ چلتا نہیں
سامنے رہ کر نہ پاؤ گے یہ ایسے لوگ ہیں

صبر کو تم بزدلی سمجھے غلط سمجھے ہو تم
وقت پڑ جائے تو پھر جیسے کو تیسے لوگ ہیں

۲۸/ اکتوبر ۲۰۱۴ء

دِکھائی دیتا ہے لیکن سراب ہوتا ہے
یہ بات یاد رکھو خواب خواب ہوتا ہے

یہاں عمل ہی عمل ہے مگر حساب نہیں
وہاں عمل نہیں ہوتا حساب ہوتا ہے

اِس ایک ہاتھ میں تسبیح رقص کرتی ہے
اُس ایک ہاتھ میں جامِ شراب ہوتا ہے

خوشی ہزار ہو لیکن وہ خوش نہیں ہوتا
وہ جس کے سر پہ خدا کا عذاب ہوتا ہے

جو منجمد ہو اُسے انجماد کہتے ہیں
جو منقلب ہو وہی انقلاب ہوتا ہے

مقام و فاصلہ کچھ اہمیت نہیں رکھتے
طبیعتوں میں اگر انجذاب ہوتا ہے

توجہ اس کی ہمارے دِلوں کی جانب کر
ترے حضور جو دل باریاب ہوتا ہے

حواس باختہ انسان کیا کرے افسرؔ
بھلا بھی کام کرے تو خراب ہوتا ہے

۳۱راکتوبر ۲۰۱۴ء

خود کی طرف کسی کو بھی راغب نہیں کیا
کہتے ہیں آج لوگ مناسب، نہیں کیا

جس نے جھکایا سر اُسے دستار بندھ گئی
پھر کچھ لحاظِ حفظِ مراتب نہیں کیا

انشاؔ، یگانہؔ یاس کے عالم میں چل بسے
غالبؔ کو اہلِ ذوق نے غالب نہیں کیا

تم سامنے تو آؤ کہ دنیا پرکھ سکے
کہنا نہ پھر سلوک مناسب نہیں کیا

افسرؔ تمام عمر مُخاطب بنا رہا
سب کی سُنی کسی کو مُخاطِب نہیں کیا

۴؍نومبر ۲۰۱۴ء

عقبیٰ کا تم خیال ذرا سا کرو تو ہو
دنیا سے احتیاط کا سودا کرو تو ہو

اِک واقعہ سمجھ کے گذر جاؤ کچھ نہو
ہنگامہ کرکے ایک تماشا کرو تو ہو

ہونی تو ہو کے رہتی ہے رکھیو نہ یہ گمان
ایسا کرو تو کچھ نہو، ویسا کرو تو ہو

وعدہ تو تم نے کرلیا، کانوں نے سُن لیا
اب دل کو اعتبار جو پورا کرو تو ہو

یہ کہہ کے جان اپنی بچاتا ہے چارہ گر
بیمار آپ کا ہے جو اچھا کرو تو ہو

جُھک کر مِلا کرو کہ یہ دنیا دبی رہے
پیدا برابری کا جو جھگڑا کرو تو ہو

باتوں میں بول چال کا رکھا کرو خیال
ہر بات ناپ تول کے بولا کرو تو ہو

دنیا سے تم کبھی کوئی دھوکہ نہ کھاؤ گے
ہاں اس پہ اعتماد زیادہ کرو تو ہو

پٹ کر لپٹنا ماں سے یہ بچّے سے سیکھ کر
پھر رب سے تم لگاؤ جو پیدا کرو تو ہو

ہو پوری کائنات تمھاری نگاہ میں
اتنا وسیع دل کا احاطہ کرو تو ہو

مدت سے اہلِ دل کی ضیافت نہیں ہوئی
تم از خیالِ خاطرِ دنیا کرو تو ہو

۱۰ر نومبر ۲۰۱۴ء

ضروری ہے ملاقاتوں میں وقفہ مختصر ہونا
شکر رنجی بڑھا دیتا ہے یوں شیر و شکر ہونا

ہماری سر بلندی ہے تمھاری سرفرازی میں
ہمارا قد بڑھاتا ہے تمھارا معتبر ہونا

کسی کو رزدار اپنا بناتے وقت یہ سوچو
کسی کو باخبر کرنا ہے خود سے بے خبر ہونا

سکوں اچھا ہمیں لگتا ہے ہم ساکت ہی رہتے ہیں
ہمیں بھاتا نہیں اِک لفظ میں زیر و زبر ہونا

ہماری آنکھ کے آنسو تمھاری آنکھ سے گرتے
تو ہم تسلیم کرلیتے وفا کا معتبر ہونا

نہیں شیوہ شریفوں کا بھٹکنا شہر میں افسرؔ
ضروری جانتے ہیں ہم ٹھکانوں کی خبر ہونا

۲۱ مئی ۲۰۱۵ء

جسم زخموں نے بنا رکھا ہے بازیچہ سا
آپ گل گشت کو نکلیں تو ہے باغیچہ سا

زخمِ پا کا ہمیں احساس بھی ہونے نہ دیا
سبزۂ نو نے بچھا رکھا ہے غالیچہ سا

ہم سے نادیدوں کو ہر گوشۂ دنیا جنّت
اور خلّاقِ جہاں کے لئے باغیچہ سا

آبلہ پائی کوئی شے ہے اسے کیا معلوم
جس کے تلووں کے تلے رہتا ہے غالیچہ سا

گم ہیں اِک ذرّے میں دنیا کہاں دیکھی افسرؔ
وہ جو غالبؔ کو تھی اطفال کا بازیچہ سا

۴ر جنوری ۲۰۱۵ء

ذرا سی دیر جو ہم شیر ہو گئے ہوتے
یہ جتنے پیش ہیں سب زیر ہو گئے ہوتے

ہماری نسل اگر کام وقت پر کرتی
پہاڑ ہیں جو کھڑے ڈھیر ہو گئے ہوتے

یہ بات کہنے میں آسان آج لگتی ہے
وہ سیر تھے تو سَوا سیر ہو گئے ہوتے

پتا زمانے کو آزردگی کا چل جاتا
جو ہم ملول ذرا دیر ہو گئے ہوتے

بھلا ہُوا کہ بُروں سے ہے دشمنی افسؔر
کہ دوستی میں تو ہم زیر ہو گئے ہوتے

۱۰رجنوری ۲۰۱۵ء

مفلسی آر پار رکھتے ہیں جیب سوراخ دار رکھتے ہیں
ہم بڑا کاروبار رکھتے ہیں ایک جاں سو اُدھار رکھتے ہیں
دوستی تار تار رکھتے ہیں دشمنی باوقار رکھتے ہیں
لغزشوں کا حساب رکھنے کو ہم قبا داغدار رکھتے ہیں
غم کا سودا پٹھان کا قرضہ ہر خوشی ہم اُدھار رکھتے ہیں
ان کی چاہت کا ہے الگ انداز جس پہ مرتے ہیں مار رکھتے ہیں
کچھ نہیں کہتے سامنے اُن کے آئینہ بار بار رکھتے ہیں
جسم پوشی ہے شہر والوں سے گھر میں جامہ اُتار رکھتے ہیں
ایک جنبش بھی ہم نہیں کرتے خواہشیں ہم ہزار رکھتے ہیں
کچھ نہ دے گا یہ جانتے ہیں مگر مدعا تو ، گزار رکھتے ہیں
پیسہ کوڑی ہمارے پاس نہیں مال تو مالدار رکھتے ہیں
وہ مسائل بھی کم نہیں رکھتے جو وسائل ہزار رکھتے ہیں

۸ر جنوری ۲۰۱۵ء

موج اگر سر بھی اُٹھائے تو تلاطم سمجھو
اتنا حسّاس نہ رہ پائے تو پھر تم سمجھو

ایک ذرّے کو بیابان سمجھ کر گذرو
ایک قطرہ بھی میّسر ہو تو قلزم سمجھو

قہقہے جانتے ہو خندۂ لب کیا جانو
تم کبھی باغ میں جاؤ تو تبسّم سمجھو

آبشاروں میں بھی اِک لَے سی ہُوا کرتی ہے
نغمۂ موجِ رواں کا بھی ترنّم سمجھو

وہ حسیں ہے اور اسے حُسن بہت پیارا ہے
حُسن ہر کام میں واجب ہے یہی تم سمجھو

وجہِ ٹکراؤ کی جو بھی ہو اسے ختم کرو
کیوں ہُوا کرتا ہے گھر گھر میں تصادم سمجھو

اپنے ہر لمحے کی قیمت کا وہ مانگے گا حساب
کیا کہوگے وہاں یہ بات یہاں تم سمجھو

چند لمحات کی قربت ہے غنیمت افسرؔ
چار چہروں کو بھی تم محفلِ انجم سمجھو

۱۱؍فروری ۲۰۱۵ء

کسے پتہ ہے کسے خبر ہے مَیں کن عذابوں میں جی رہا ہوں
جسے پتہ ہے جسے خبر ہے مَیں اس کے خوابوں میں جی رہا ہوں

کبھی کبھی جو کہیں کہیں سے کرن سی چھن چھن کے آ رہی ہے
مَیں اس کرن میں یہ دیکھتا ہوں کہ کن خرابوں میں جی رہا ہوں

مجھے نہ ڈھونڈو مجھے نہ پوچھو مجھے نہ پاؤ گے گر مِلو بھی
مَیں اپنی قوسوں میں دائروں میں الگ حسابوں میں جی رہا ہوں

مَیں پا بہ جولاں ، میں دل گرفتہ ، ملول چہرہ لئے کھڑا ہوں
مگر یہ سب کو دِکھائی دے گا کہ مَیں گلابوں میں جی رہا ہوں

کوئی نہ گذرا کوئی نہ آیا گھڑی گھڑی موج سے مَیں اُبھرا
یہ بعد مرنے کے مَیں نے پایا کہ اب نصابوں میں جی رہا ہوں

جلا چکا ہوں مَیں باغ سارے ، بجھا چکا ہوں چراغ سارے
مَیں کس خرابی سے اُٹھ کے آیا اور ان خرابوں میں جی رہا ہوں

جو میری نسلیں ہیں ان کو افسرؔ مری بدی کے ثمر ملیں گے
مَیں جو بزرگوں کی نیکیوں سے مِلے ثوابوں میں جی رہا ہوں

۲۶ رفروری ۲۰۱۵ء

کچھ لوگ اُٹھے اس محفل سے اور قبروں میں آباد ہوئے
پھر ان کے پیچھے رہنے والے رو رو کر برباد ہوئے

شاداں فرحاں رہتے تھے ہر بات پہ خنداں رہتے تھے
مدت ہوئی اب ہم کو ہنسے گذرا ہے زمانہ شاد ہوئے

ہونٹوں کی ہنسی ، چہرے کی خوشی یکبارگی ہی کافور ہوئی
کھل جاتی تھی جن سے دل کی کلی وہ لوگ تو بس اِک یاد ہوئے

ہم صحرا صحرا بھٹکے ہیں ، ہم چہرہ چہرہ ترسے ہیں
اب شہر میں جائیں کس کے لئے وہ لوگ عدم آباد ہوئے

مدت تھی سزا کی پوری کی اور چل دئے تم تو راضی خوشی
ہم قید بھی بھگتیں، غم بھی سہیں، کیوں ہم پہ ستم ایجاد ہوئے

اب ان کی کہانی کہتے ہیں کل قدر نہ جانی کہتے ہیں
تھے کیسے جواہر اور موتی ناقدری میں برباد ہوئے

اب رونا خود کو کھونا ہے کیا رونے سے اب ہونا ہے
افسر وہ کہے گا تم سے یہی کیوں رو رو کر برباد ہوئے

۲۸/مارچ ۲۰۱۵ء

مَیں ہوتا ہوں مگر ہوتا نہیں ہوں
اسی ڈر سے تو مَیں سوتا نہیں ہوں

خوشی کی فصل مَیں بوتا نہیں ہوں
نتیجہ یہ کہ مَیں روتا نہیں ہوں

دوئی کا بیج مَیں بوتا نہیں ہوں
کبھی تقسیم مَیں ہوتا نہیں ہوں

جو پاتے ہیں وہ کھوتے ہیں یہ سچ ہے
نہیں پاتا تو کچھ کھوتا نہیں ہوں

مری آنکھیں ہی پی جاتی ہیں ان کو
مَیں اشکوں سے زمیں دھوتا نہیں ہوں

یہ سرگوشی مَیں سُنتا ہوں مسلسل
کھٹکتا دل میں ہوں ہوتا نہیں ہوں

مَیں سب کے واسطے روتا ہوں لیکن
مَیں اپنے واسطے روتا نہیں ہوں

کبھی ملتے کہاں ہیں چاند سورج
وہ ہوتا ہے تو مَیں ہوتا نہیں ہوں

مَیں محنت کش کے بیٹے کا ہوں بیٹا
کسی نوّاب کا پوتا نہیں ہوں

ضرورت بھر کا مَیں رکھتا ہوں رشتہ
مَیں دولت کا سگا ہوتا نہیں ہوں

اُگاتا ہوں ہتھیلی پر مَیں فصلیں
کسی کا کھیت میں بوتا نہیں ہوں

تم اِک آواز دو اور مَیں حاضر
بہت دوری پہ مَیں ہوتا نہیں ہوں

مری فطرت ہے افسرؔ شعر گوئی
مگر یہ بوجھ مَیں ڈھوتا نہیں ہوں

۱۱/اپریل ۲۰۱۵ء

اشارہ ملتے ہی موسم کا یوں سجی ڈالی اُتاری زَرد رِدا سبز اوڑھنی ڈالی
بس اتنی دیر اُجالے میں آ گیا تھا مَیں نگاہ مجھ پہ جو تم نے کبھی کبھی ڈالی
اسی نے اوڑھ رکھی ہے تو کیا کرے کوئی مِرے خدا نے تو اس پر نہ مفلسی ڈالی
ہَوا کے زور میں یہ خود ہی ٹوٹ کر بکھرے وگرنہ پتّوں سے بے زار تو نہ تھی ڈالی
ہمارا یہ ہے کہ بے کل نہوں تو چین نہو ہمارے دل میں ازل سے ہے بے کلی ڈالی
نظر کے پھیر نے دنیا کو کر دیا بدنام نظر خود آپ نے اس پر عجیب سی ڈالی
اندھیرے گھر کو یقیناً وہ روشنی دے گا کہ جس نے چاند ستاروں میں روشنی ڈالی
یہ اس حسین ادا ہی کا اِک کرشمہ ہے مِرے بیاں میں جو ندرت کی چاشنی ڈالی
کسی کا ہنستے ہوئے دیکھنا بھی جادو ہے کِھلی اُمید کی کونپل ہری ہوئی ڈالی
ہمارے حق میں دعا کیجئے کہ خیر سے ہو ہمارا خاتمہ' یہ زندگی تو جی ڈالی
بخیل شخص کے ابرو کھنچی کھنچی ٹہنی سخی کا ہاتھ ہے افسرؔ جھکی جھکی ڈالی

۳۱ رمئی ۲۰۱۵ء

SHOLAE GUL SE RANGE SHAFAQ TAK
POETRY BY :
SAEED AFSAR
مرتب : شکیل اعجاز